

اپنی خوش لوک سے لوک

حیات و موت سے مراد

کی ہر بات پر غور کرنا
اور ہر بات پر غور کرنا
اور ہر بات پر غور کرنا



اچھے لوگ۔ بُرے لوگ

خسرو نت سنگھ

کاتبِ شعر و ادب۔ ممن آباد۔ لاہور۔ ۲۵

ترتیب

- ۱:- زلفی ہمارا ہمسایہ : ۵
- ۲:- شکیلہ بانو سحر آفرین آواز : ۱۵
- ۳:- ڈی۔ کے بروغ ہٹکراتا ہوا بندھ : ۱۸
- ۴:- بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی : ۲۳
- ۵:- نراڈ چودھری : ۲۴
- ۶:- معجزہ ساز دادا جی : ۲۲
- ۷:- موم بٹی کی روشنی اور دانا بیل : ۲۵
- ۸:- مراد جی ڈیسانی : ۲۹
- ۹:- سنجے کاندھی : ۴۲
- ۱۰:- گورو گول واکر : ۸۱
- ۱۱:- جے۔ پی۔ ایک مکمل انقلابی : ۸۹
- ۱۲:- جادو بھری آواز رونا لیلہ : ۹۹
- ۱۳:- ہیرا سنگھ : ۱۰۱

ناشر نواز چودھری
 مطبع شکر گنج پرنٹرز لاہور
 قیمت روپے

سول ایجنٹ :
 چودھری اکیڈمی ○ افضل مارکیٹ - ۱۷ - اردو بازار
 لاہور

- ۱۴:- آندری مال راکس دھاکہ خیز قوت: ۱۰۴
- ۱۵:- کرشنا مینن اکیلا بھڑیا: ۱۱۵
- ۱۶:- فرینک مورلیس: ۱۲۱
- ۱۷:- گورو دیو۔ مکت آنند: ۱۲۴
- ۱۸:- منظور قادر ایک پھڑا ہوا دوست: ۱۳۰
- ۱۹:- ڈاکٹر الیس۔ رادیا کرشن ایک تخلیقی جوہر: ۱۳۵
- ۲۰:- رامن راگھاؤ اسے پھانسی دو! : ۱۳۸
- ۲۱:- ستیہ جیت رے: ۱۴۶
- ۲۲:- بلراج ساہنی: ۱۵۰
- ۲۳:- بھگوان شری نیل کننہ لکھنہ جی: ۱۵۲
- ۲۴:- ساسنی بُرت عورت باز: ۱۵۵
- ۲۵:- بالا صاحب تھیکری ایس۔ ایس۔ چیف: ۱۶۲
- ۲۶:- دانیال وال کاٹ فضائی سمگلر: ۱۶۷

زُلفی — ہمارا ہمسایہ

۱۹۷۶ء میں محمد علی جناح کے سو سالہ مشن ولادت پر وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے

بھی مدعو تھا۔ مجھے بھٹو صاحب سے متعارف کرایا گیا ان کی دوستی میں گرم جوشی تھی میں نے ان سے انٹرویو کی درخواست کی۔ انہوں نے چند روز بعد دن کا کچھ حصہ میرے ساتھ گزارنے کا وعدہ کیا۔ اور آئندہ روز ہی میری ان کی ملاقات کا وقت طے ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو بیک وقت تین شخصیتوں کا مالک ہے جاگیر دارانہ مزاج کا حامل مذہبی زمین دار۔ آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ یورپیوں کی طرح خوش اخلاق اور خوش الحوار اور سیاستدانوں کی سی مکاری کا حامل سیاستدان وہ موقع کے مطابق اپنی شخصیت کے کھر کو بُروئے کا رلاتا ہے۔

وزیراعظم بھٹو کی راولپنڈی والی رہائش گاہ کسی خاص طرز تعمیر سے عاری اور ایک منزلہ ہے۔ البتہ اس کے ارد گرد پنجابی اور پنجان دراز قد فوجی پاسبان کا حفاظتی پہرہ لیکن یہ پہرہ بھی حقیقت سے زیادہ شناسائی معلوم ہوتا ہے پاکستان میں کئے والے کسی بھی شخص کو ذوالفقار علی بھٹو کی غیر معمولی ہر دل عزیز بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ پاکستان کی ایک شخصی جمہوریت کا بانی اور محافظ ہے۔ اسے ڈی سی مجھے اس کمرے میں لے جاتا ہے جہاں انسائیکلو پیڈیا برٹیکا کی ضخیم جلدیں کمال احتیاط کے ساتھ قطار اندر قطار رکھی ہیں۔ دیوار پر استاد اللہ بخش کے شامل پر مبنی پنجابی ٹیاردوں کی ایک بہت بڑی آئل ٹینگ آویزاں ہے قریب ہی ٹرگس کے پھولوں سے بھرا ایک گلاس جس سے بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ بھٹو صاحب عین اس لمحے اندر آتے ہیں جو ملاقات کے لیے

مختص ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جلدی میں ہیں اور خوش گیسوں کا وقت نہیں۔ یہی
فوراً ان سوالوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو میں نے ملاحظہ رکھے ہیں

س۔ شملہ بھوتے پر عمل درآمد کے لیے آپ کے ذہن میں کون سے ٹھوس اقدام ہیں؟
ج۔ شملہ بھوتے پر دونوں جانب سے عمل ہو رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں
ہی نے شملہ بھوتے میں شامل مسائل میں سے ایک بڑے مسئلے کے علاوہ سب کا حل تلاش
کر لیا ہے۔ تجارت بحال کی جا چکی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں۔
فضائی سفر بحال کیا جا چکا ہے اور دونوں ملکوں کے عوام اس سفر سے مستفید ہو رہے
ہیں۔ حالات معمول پر لانے کا عمل جاری ہے۔

(میں حالات کے معمول پر لانے کے بارے میں کچھ اور دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن
میں نے سوچا کہ بعد میں پوچھوں گا)

س۔ لیکن ابھی تجارت اور عوام کی آمد و رفت میں بہت کچھ کیا جانے والا ہے
ج۔ تجارتی روابط بحال ہونے میں کچھ دیر تو لگے گی ہی۔ گزشتہ دس گیارہ سال سے
دونوں ملکوں کے درمیان تجارت نہیں ہوئی۔ اب تجارت پیشہ لوگوں اور صنعت کاروں
کے درمیان پرانے روابط بحال ہو رہے ہیں یا نئے رشتے استوار ہو رہے ہیں اب نئے
معاهدے عمل میں لائے جا رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ اس طرح باہمی مفاد کی خاطر تجارت
میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

س۔ کیا بھارت سے اشیاء خریدنے پر کوئی پابندی تو نہیں لگائی گئی۔

ج۔ عام طور پر تو ایسی کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہیے جو چیز معیاری ہوگی اور
ہمیں دوسرے ملکوں کی نسبت بھارت سے ارزاں نرخ پر ملے گی تو ہم کیوں نہ خریدیں
گے لیکن ہم ایسی تجارتی پالیسی وضع نہیں کرنا چاہتے جس کی بنا پر ہماری تجارت کا دارو
مدار صرف ایک ہی ملک تک محدود ہو کر رہ جائے اور نہ ہی ہم ان ملکوں کے ساتھ تجارتی
روابط ختم کر سکتے ہیں جن کے ساتھ ہم ایک طرح سے تجارت کر رہے ہیں۔ ان تجارتی
روابط نے ہماری تجارت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ہم تجارت کا عمومی ڈھانچہ تبدیل

نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن پھر بھی اصل اہمیت قیمتوں کی اور اشیاء کی کوالٹی کی ہے۔ لیکن
بھارت کے ساتھ تجارت میں کوئی رکاوٹ یا پابندی ہرگز نہیں۔

س۔ کیا ایسا خطرہ لاحق ہے کہ کسی ایک شے کی تجارت میں پاکستان، بھارت کا دست
نگر ہو کر رہ جائے گا۔

ج۔ اب ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ کسی ملک کا ایسے سلسلے میں دست نگر ہو جاتا حقیقت
کی بجائے زیادہ خوف پر مبنی ہی ہوتا ہے اگر کسی ملک کو کوئی خاص چیز مہیا نہ ہو تو اس
کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس ملک کا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ء میں ہماری
فوجی رسد بالکل ختم ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں ہمارے ملک پر پابندی بھی لگ چکی
تھی۔ اس وقت ہمیں صرف امریکہ سے فوجی ساز و سامان ملتا تھا لیکن ہم نے نئے
ذرائع تلاش کئے اور ہمیں دوسرے ملکوں سے بھی فوجی سامان موصول ہوا۔ البتہ وقت
کی دشواری کا مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن ذرائع رسل و رسائل کے اس تیز رفتار دور میں اس
کی بھی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ نئے سامان سے واقفیت پیدا کرنا اور اس کی تربیت
حاصل کرنا بھی ایک مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن اس پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے ہم ایک ہی
ملک تک محدود ہونے کا تجربہ کر چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ صرف ایک ہی ذریعے
کے بار آور نہ ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیے اس لیے اگر ہمارے تجارتی شعبے کا ایک
حصہ بھارت سے لوہے، شیل، ٹریکٹر یا کسی بھی شے کی تجارت کرتا ہے تو ہمیں محدود ہونے
کا اندیشہ نہیں ہوگا کیونکہ آخر کار بھارت بھی تو ہم سے کچھ نہ کچھ خریدے ہی گا اگر باہمی
تجارت میں ایسے حالات پیش آئے بھی تو ہم اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں ان سے
نشت لیں گے اس سلسلے میں ہمیں خامی بھارت حاصل ہے۔

(اب میں ایک خارا دار سوال کی طرف آتا ہوں)

س۔ جب آپ کہتے ہیں کہ صرف ایک بڑا مسئلہ باقی رہ گیا ہے تو میرا خیال ہے کہ
آپ کشمیر کی بات کرتے ہیں؟

ج۔ ہاں یہ بات درست ہے جموں کشمیر کا مسئلہ ہی وہ واحد مسئلہ ہے جو شملہ بھوتے

کے مسائل میں سے باقی رہ گیا ہے اس بھوتے کی رو سے مسئلہ کشمیر پر دونوں حکومتوں کے درمیان ہر قسم کے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کسی بہتر ماحول میں گفتگو کرنا طے پایا ہے یہ سوال بہت سے دیگر فیاضیوں اور اخبار نویسوں نے بھی مجھ سے پوچھا ہے۔ دونوں ملک اس مسئلے پر مناسب وقت پر باہمی مذاکرات کریں گے۔

اس کے علاوہ سلال ڈیم کا مسئلہ بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کا مناسب حل بھی تلاش کر لیا جائے گا۔ درحقیقت سلال ڈیم بھی مسئلہ کشمیر ہی کا ایک حصہ ہے لیکن اس ڈیم کا مسئلہ معاہدہ سندھ طاس کے تحت بھی آتا ہے اس لئے عام طور پر یہ مسئلہ شملہ بھوتے کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ میں ہمیشہ ہی کہتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت کے انتخابات کے بعد بھی دونوں ملک اس مسئلے پر سوچ بچار کریں گے لیکن یہ اس وقت تک کی بات ہے جب آپ کی حکومت نے انتخابات ایک سال تک ملتوی کر دیئے اس کے بعد میں نے یہ بیان نہیں دوہرایا۔ ہم ۱۹۷۷ء میں انتخاب کر دیں گے اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت مذاکرات میں بہتر طور پر شامل ہوگی میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہماری پارٹی کی حکومت بنی تو ہم آپ کی حکومت سے باہمی مذاکرات کریں گے اور اس کا مطلب شملہ بھوتے پر صحیح معنوں میں عملدرآمد ہوگا۔

س۔ کیا آپ کے ذہن میں کشمیر کے بارے میں کوئی نئی تجاویز ہیں؟
ج۔ نہیں نئی تجاویز کی کیا ضرورت ہے۔ شملہ بھوتے میں اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے لیکن جب مذاکرات کا آغاز ہوگا تو پھر ہم یہ دیکھیں گے دوسرا فریق اس بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور پہلے سے طے شدہ امور پر کتنا عمل کرتا ہے۔ اگر بھارت کا خیال ہو کہ اس مسئلے کے لیے یہ بنیاد مضبوط نہیں تو پھر بھارت ہی کو بتانا ہوگا کہ مذاکرات کن بنیادوں پر ہوں گے۔ پاکستان کی اصولی بنیاد وہی ہے جو ہم ایک عرصے سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں کہتے آئے ہیں۔ اگر بھارت اس طے شدہ امر کو نہیں مانتا تو پھر اسے ہی بتانا ہوگا کہ وہ اس بارے میں کیا کرنا چاہتا ہے ہمارے پاس تو اس کے علاوہ کوئی بنیاد نہیں۔ ہم صرف مسئلے کے جمہوری حل پر یقین رکھتے ہیں یعنی

عوام کی رائے کے مطابق آپ میرے تمام فیصلوں کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے کبھی کوئی فیصلہ جمہور کی آواز کے خلاف نہیں کیا۔

س۔ کیا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ مفید ہوگا؟

ج۔ یہ مسئلہ بھی شملہ بھوتے میں زیر غور آیا تھا اور ہم نے یہ محسوس کیا تھا کہ عدم جنگ کا معاہدہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے تمام مسائل حل ہو چکے ہوں۔ تمام مسائل طے ہونے کے بعد بھی جنگ ہو سکتی ہے لیکن اگر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنا ہو تو پھر پہلے تمام چھوٹے بڑے مسائل حل ہونے چاہیں مثال کے طور پر سندھ طاس معاہدے کے مسائل وغیرہ۔ یا الفاظ دیگر اگر دوطرفہ مذاکرات ناکام ہو جاتے ہیں تو ہم اپنی جگہ واپس آ سکتے ہیں کوئی درمیانی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کسی کو ثالث مقرر کر سکتے ہیں یا پھر بین الاقوامی عدالت انصاف سے رجوع کر سکتے ہیں۔ صرف اور صرف بین الاقوامی قانون کے تحت ہم خود اختیارانہ طور پر مسائل کا حل تلاش کر لیں تو پھر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو پھر ایسے معاہدے میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ دونوں حکومتوں نے مسئلہ کشمیر کو التوا میں ڈال دیا ہے۔

س۔ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ آپ کی ذہنی ہم آہنگی کس سطح پر ہے؟
ج۔ میں نے آپ کو گزشتہ رات بھی بتایا تھا کہ مسز گاندھی نے شملہ بھوتے میں نہایت کارآمد اور مخصوص قدم اٹھایا ہے۔ انہوں نے جرأت اور عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ اس معاہدے میں خاص نظر آتی ہیں اور ہمارے ملک کے ساتھ نارمل اور دوستانہ تعلقات کی خواہش مند ہیں۔ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران میں تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششیں بار آور ثابت ہوئی ہیں اور یہ صرف اسی صورت میں ہوا ہے کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں معمول کے تعلقات میں خاص ہیں۔ اس سے آپ خود مسز گاندھی کے ہندو پاک تعلقات کے بارے میں نقطہ نظر سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔
س۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے انہیں پاکستان کے دوسے کی دعوت دی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ بالکل شملہ بھوتے کے دوران ہی میں نے انہیں اپنے ملک آنے کی دعوت دی تھی اور اس کے بعد بھی میں اس دعوت کا اعادہ کرتا رہا ہوں۔
س۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پوری مشترکہ منڈی کی طرح بنگلہ دیش، پاکستان اور بھارت کی بھی کوئی ایسوسی ایشن بن سکتی ہے؟

ج۔ فی الحال تو میں ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کی طرح ان تین ملکوں کے درمیان اس قسم کا کوئی معاہدہ ہو سکتا ہے کیونکہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی صورت حال ایسی ہے جیسی کہ یورپی ملکوں کے درمیان معاہدے کے وقت تھی اگرچہ یورپی ملکوں کے درمیان کوئی شدید اختلافات نہیں تھے پھر بھی انہیں اس معاہدے پر پہنچنے کے لیے خاصی دیر لگی۔ یورپی ملکوں میں سیاسی شعور بچتا ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ وہ حکومتیں خاصی پرانی ہیں یا ان کی تہذیب ایک قدیم تہذیب ہے۔ بلکہ ان کے درمیان چھوٹے بڑے مسائل سلجھانے کی قوت اور استعداد بھی ہے ان ملکوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ صرف ایک ہی نشست میں طے نہیں پایا تھا۔ یورپی ملکوں کے درمیان پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش جیسے معروضی حالات نہیں۔ ابھی ہمارے تعلقات بچتے نہیں چوسے۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش اور بھارت کے درمیان وہ تعلقات نہیں جو آج سے دو سال پہلے تھے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بھارت، بنگلہ دیش سے اپنے شکستہ تعلقات بحال کرنے کی کوشش میں ہے۔ فرخا بیراج کے بارے میں وزارتی سطح پر جو مذاکرات ہو رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ملک اپنے کشیدہ تعلقات کی بہتری کی خاطر معروضی عمل میں لہذا اولین ضرورت تو یہ ہے کہ بھارت اور بنگلہ دیش کے باہمی تعلقات بہتر صورت اختیار کر جائیں۔ اسی طرح بھارت اور پاکستان کے تعلقات میں ابھی بچنگی کی کسر ہے اسی طرح پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان بہت کچھ کرنا باقی ہے جب ہم تینوں ممالک اپنی اپنی سطح پر ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تب ہی کسی بڑے سمجھوتے یا ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھنے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔

س۔ پاکستان نے چین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو قریب لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے کیا پاکستان ہمارے درمیان ایسا نہیں کر سکتا؟
ج۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان
س۔ نہیں بھارت اور چین کے درمیان؟

ج۔ خوب بھارت اور چین نے سفارتی سطح پر کچھ تبدیلیاں نہیں ہیں اور یہ بہت سی نمایاں تبدیلی ہے اور میرے خیال میں آپ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کی صورت نظر آرہی ہے۔ لیکن چین ایک بڑی طاقت ہے اور ہمیں بڑی طاقتوں کی سیاست کا خیال بھی رکھنا ہے۔ بھارت اور چین کے تعلقات کی بہتری، پاکستان کے کسی اقدام پر منحصر نہیں ہے کسی بھی چھوٹے ملک کے دنیا کی تین بڑی طاقتوں میں سے کسی کے ساتھ تعلقات کا انحصار کلی طور پر مختلف عناصر پر ہے۔

س۔ میں آپ کے کچھ اندرونی ملکی مسائل کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں آپ نئی روشنی کے فرد ہیں۔ آپ اپنے ملک میں ترقی پسندانہ قوانین لانے کے لیے مقامی علماء کے رویے کے بارے میں کیا کہیں گے؟

ج۔ مجھے ان سے کسی خطرے کی توقع نہیں۔ ماضی میں علماء نے حکومتوں کو کافی پریشان کیا۔ بعض تو علماء کے حق میں تھیں۔ بعض بالاعتدال پارٹی کی سطح پر ان سے بیزار تھیں۔ میرا ان کے ساتھ بالکل مناسب رویہ ہے۔ ایک ترقی پسند مسلمان کی حیثیت سے میں ان کے سامنے ہوں مجھے اعتراض ہے کہ اس معاشرے میں ان کی ایک حیثیت ہے۔ لیکن میں یہ طے کرنے کے لیے تیار ہوں کہ سماجی سدھار میں ان کی حیثیت کوئی بنیاد مہیا کرنی ہے۔ اسی لیے میں پاکستانی معاشرے کو جدید بنانے کے لئے اپنی اصلاحات نافذ کر رہا ہوں۔ نہ ہی میں ان کے ساتھ کسی قسم کا تصادم چاہتا ہوں۔ میں اپنی اصلاحات کی وضاحت ان کے سامنے اسی انداز میں پیش کرتا ہوں جو انداز وہ سمجھتے ہیں۔ اس سے ناامد ہوا ہے۔ میری پارٹی!!؟

س۔ کیا آپ نے قانون شریعت میں بھی کوئی اہم اصلاحات کی ہیں؟

ج۔ بالکل نہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلامی عائلی قوانین جو کہ قانون شریعت پر مبنی ہیں ہمارے ملک میں نافذ ہیں۔ صرف سرداری قوانین اور قبائلی قوانین کو ختم کر کے قانون شریعت نافذ کیا گیا ہے۔ یہ ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ بلوچستان اور سرحد کے کچھ علاقے میں سرداروں کے بنائے ہوئے جاگیردارانہ قوانین کو ختم کر کے وہاں قانون شریعت کی بالادستی قائم کی گئی ہے۔

س۔ تعدد ازدواج اور طلاق کے قوانین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔
خواتین آج بھی ان قوانین کا جبر برداشت کر رہی ہیں۔

ج۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔ تاہم عورتوں کے آزادی کی خاطر تعدد ازدواج اور پردہ اور طلاق کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہم نے خواتین کے لیے زیادہ مگرز متیں مہیا کی ہیں بلکہ حکومتی سطح پر اہم ملازمتیں۔ اب وہ ملک کے تقریباً ہر شعبے میں موجود ہیں۔ اس طریقے سے ہم ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور معاشرے میں باعزت مقام مہیا کرنے میں ان کی مدد کر رہے ہیں۔

س۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟
ج۔ ہمارے ہاں اسقاطِ حمل کو قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے اور ہم اسے قانونی تنظیمیں گے بھی نہیں۔ ہم نے خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں زبانِ بات چیت کی بجائے عملی اقدام کیے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو اس کی تعلیم دی ہے۔ ہم نے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں لوگوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے۔ اب وہ عام طور پر مانعِ حمل ادویات استعمال کرتے ہیں ہر جہاں سمجھتے۔ ان خطوط پر عمل پیرا ہو کر ہم بہتر نتائج حاصل کر رہے ہیں ایسے نتائج جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ فائدہ مند ہوں گے۔ لیکن ہم کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتے کیونکہ اس سے بعض اوقات برعکس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

س۔ پاکستان میں نس بندی کا کوئی پروگرام نہیں ؟
ج۔ نہیں صرف رضا کارانہ طور پر نس بندی کا انتظام ہے۔ قطعاً رضا کارانہ۔

س۔ پاکستان میں اقلیتوں کا کیا حال ہے۔ غالباً ان کی تعداد آبادی کا ۵ فیصد ہے۔
ج۔ جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے میں آپ کو بلا خوف تردد بتا سکتا ہوں کہ ہم ان کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں مقننہ اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی ہے۔ ان کے معاملات کے لیے ایک الگ وزارت موجود ہے اور حال ہی میں ان کے حوالے سے ایک ہفتہ بھی منایا گیا ہے۔

ملازمتوں کے حصول یا میڈیکل یا پیشہ ورانہ تدریس کے کالجوں میں داخلے کے لیے اقلیتوں پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ حکومت میں شریک ہیں اور ہمارے بعض اقلیتی برادر تو بیرونی ملکوں میں سفیر بھی ہیں۔ اسی طرح میری حکومت نے ان کا اعتماد زیادہ بلند کیا ہے اور انہیں احساس دیا ہے کہ وہ بھی مساوی شہری حقوق کے حامل ہیں۔

س۔ پاکستان چونکہ ایک اسلامی ریاست ہے اس لیے کیا وہ اپنے آپ کو دوسرے درجے کا شہری نہیں سمجھتے۔

ج۔ ہرگز نہیں۔ ایسا سمجھنے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں۔
س۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی سربراہ ملک بننے کی خواہش نہیں کر سکتا۔
ج۔ یہ صرف پاکستان میں ہی نہیں۔ برطانیہ میں صرف ایک پرنسٹنٹ ہی شہنشاہ ہو سکتا ہے اور دوسرے مالک ہیں بھی ایسی پابندیاں ہیں۔ بات اصولی اور عملی سطح کی ہے۔ ملک کی سچاسی سے نوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے لہذا وہ جب بھی کسی کا انتخاب کریں گے تو وہ ان ہی میں سے ایک ہو گا۔

س۔ کیا آپ قائد اعظم کے سو سالہ جشنِ ولادت پر کوئی پیغام دیں گے۔
ج۔ میں اس سلسلے میں پہلے ہی بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ اس وقت ہم اس جشن کی تقریبات کے آخری ہفتے میں ہیں۔ آپ چونکہ ایک بھارتی شہری ہیں۔ اس لیے میں آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ قائد اعظم نہ ہندوؤں کے خلوت تھے نہ بھارت کے۔ پہلے پہل۔ اپنے کیرئیر کے آغاز میں قائد اعظم کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اخوت کا سفیر کہا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں جب ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے

تو انہوں نے پاکستان کا نعرہ لگایا۔ لیکن آپ کو یاد ہو گا کہ پاکستان کی تخلیق کے بعد بھی قائد اعظم بہتر ہندو پاک تعلقات کے خواہاں تھے۔

اس وقت ہم تعلقات کو معمول پر لانے کی بات کر رہے ہیں۔ قائد اعظم نے اس وقت یہ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی بات کی تھی۔ اور وہ بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے زبردست خواہش مند تھے۔ بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات ان کی نظر میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ اگر پاکستان کی پیدائش کے سال بھر بعد ان کا انتقال نہ ہو جاتا تو یہ بات زیادہ وضاحت سے سامنے آتی۔ قانون ساز اسمبلی میں ان کی تعاریف سیکورہ رجحان کی حامل تھیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو پاکستان میں رہنے اور ہجرت نہ کرنے کی کوشش بھی کی جب ۱۹۴۸ء میں کراچی میں فسادات برپا ہوئے تو قائد اعظم بہت فکر مند ہوئے۔ قائد اعظم کی اس سوچ کو زیادہ عام نہیں کیا گیا لیکن وہ موجود تو ہے۔ اگرچہ وہ پاکستان کے خالق اور بانی تھے تاہم انہوں نے بھارت یا بھارت کی قومی برتری کے بارے میں کبھی بغض کا اظہار نہ کیا۔ وہ تو بھارت اور پاکستان کو سوڈن اور ناروے کی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ دو الگ الگ ملک لیکن خود اختیار، مساوی اور دوستی کے رشتے میں جوڑے ہوئے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تو بمبئی میں اپنا گھر محفوظ رکھنا چاہتے تھے تاکہ اگر کبھی وہاں جائیں تو دو چار ماہ گزار سکیں۔ یہ ان کی اولین سوچ تھی مگر بد قسمتی سے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو گئے اور تعلقات بدتر ہوتے گئے۔

ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے قائد اعظم کی اس قسم کی تعاریف اور بیان پس پشت ڈالنے کی کوشش کی۔ حیدر آباد، جونا گڑھ اور کشمیر میں ہونے والے واقعات کے باوجود قائد اعظم باہمی خوش گوار تعلقات پر مضر تھے۔ یہ بات عکس کی جاسکتی ہے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید یہ مسائل پیش ہی نہ آئے۔ لیکن ان کی موجودگی میں ایسا ہوتا بھی تو وہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے تمام مسائل حل کر لیتے۔ یہ تھا قائد اعظم کا نقطہ نظر۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ بعض اوقات تاریخ کے کچھ اوراق گم ہو جاتے ہیں اور ہم بہت سی اہم واقعات اور عوامل سے محروم رہ جاتے ہیں۔

شکیدہ بانو۔ سحر آفریں آواز

شکیدہ بانو۔ ایک نابالغ روزگار۔ اس ملک میں کسی مرد، عورت، سیاسی لیڈر شاعر، فلم ایکٹر یا مذہبی رہنما نے لوگوں کے دلوں پر حکومت نہیں کی سوائے شکیدہ بانو کے جس کی آواز میں وہ جادو ہے جو کسی گھنٹوں تک لوگوں کو حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔ ایک درشت آواز جیسی ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں سانس کی تکلیف ہو، ایک قبول صورت چہرہ لیکن میک آپ زدہ اور موٹاپے کی جانب مائل جسم۔ اس کا لباس بھی اس کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ سفید زمین کو چھوتا ہوا لباس اوپر سے بہتر، زرد پھولوں سے ڈھکا ہوا سونے اور چاندی کے رنگوں کی لیس سے مرصع جس پر گول ٹکے چمک رہے ہیں۔ زیورات سے لدی پھندی۔ عر دسی ٹیکہ کان میں بالیاں، ناک میں نتھہ، نیکیس بازوؤں میں منہری بازو بند، مارلن مینرو کی طرح کی جنسی نفاس۔

شکیدہ بانو وقت کی پابند نہیں اور اس وجہ سے بہت بدنام ہے۔ لوگ انتظار کرتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، بلبلوں اور کتوں کی آوازیں نکالتے ہیں لیکس بنڈال چھوڑ کر جاتے ہیں۔ ایک گھنٹہ انتظار کیا مطلب۔ "اس کے کسی سازندے سے پوچھ لیجئے۔" وہ تو دلالت میں بھی دیر سے پہنچتی تھی۔

شکیدہ بانو کسی مغل ملک کی طرح نمودار ہوئی ہے جسے متکاروں کا ایک گردہ اس کے گرد ہوتا ہے۔ پاندان بردار، آبدار، پکھا کرنے والا اور بہت سے دوسرے ایسی ملک سے لیٹ آنے پر کون جواب پر سی کر سکتا ہے۔ لوگ تو بس اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے اور وہ بغیر کسی ہنگامے کے شروع ہو جاتی ہے

وہ اپنے سامعین کے دلوں پر جادو شک دیتی ہے مائیکروفون پر گلا صاف کرتی ہے۔ اُسے تنگ کرنے کے لیے ہزاروں لوگ گلے صاف کرتے ہیں۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں ہر ایک چہرے پر مرکوز کرتی ہے اس مصنوعی ناراضگی سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے اور مجمع قہقہوں کی پیٹ میں آجاتا ہے۔ آرکسٹر کو خاموشی کا حکم دیتی ہے اور مائیکروفون پر گہرا سانس لیتی ہے۔ ہال کے تمام کونوں سے لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ انہوں نے اس کا ہر نغمہ سن رکھا ہے تاہم وہ اسے بار بار سننا چاہتے ہیں۔ وہ احتجاج کرتی ہے اور پھر وہ آخری لفظ ادا کرتی ہے۔ اس کا آخری لفظ ہوتا ہے۔ "لاں"۔ وہ اپنے چوٹی کے نغمے سے شروع کرتی ہے بہار آنے۔ لوگوں نے سینکڑوں دفعہ یہ نغمہ سنا ہے۔ شکید اسے ہر مرتبہ نئے شعروں اور دوہوں کے ساتھ نازہ کرتی ہے۔ وہ تمام سامعین کو اپنی آواز کے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ وہ دیر سے آنے والے کے لیے رکتی ہے۔ اسے سرزنش کرتی ہے اور پھر طرّا کہتی ہے۔ حضور ہم نے آپ کا خاصا انتظار کیا۔ اب ہمارا دل مطمئن ہے۔ وہ مردوں سے فطرت کرتی ہے لیکن عورتوں کو بھی نہیں بخشتی۔ بہن۔ یہ ہمارے لیے ہے۔ میرے اور تمہارے لیے۔ وہ نغمے کے کسی بول کی طرف متوجہ کر کے کہتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ سننے والوں میں سے بہت سے اس کی اردو اور فارسی نہیں جانتے پھر وہ آسان ہندی میں ترجمہ کر ڈالتی ہے۔ اور پھر بالکلی ہی کسی ادنیٰ کرسی پر بیٹھے سردار کی طرف فقرہ پھینکتی ہے۔ سردار جی۔ یہ آپ کے لیے۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ سردار اس کا کوئی گہرا دوست ہے لیکن شکید کے لیے سب برابر ہیں۔ ہر کوئی ہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی زیادہ دوست ہے۔

مومن سون کا گیت شروع ہوتا ہے۔ تالیاں بجاتی ہیں ڈھول پٹیا جاتا ہے اس کی ماں جمیلہ بانو آہستہ آواز میں شامل ہوتی ہے۔ عبدالوحید خاں اپنی بلند آواز سے ساتھ دیتا ہے۔ شکید اسے گھورتی ہے۔ وہ آہستہ کہہ رہا ہے قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ ان قہقہوں پر وہ پھر فقرے پھینکتی ہے۔ اس کا بھائی اور پس محمد خاں جو ہر قسم

کا ساز بجا لیتا ہے اپنے موٹے پیٹ سے گڑا گڑاتا ہوا ہنستا ہے اور ساری محفل اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔

شکید کسی ملکہ عالیہ کی مانند اپنا ہاتھ روک لیتی ہے۔ خاموشی۔ "جگنو۔ کوئی بالکلی سے چیختا ہے۔ وہ جگنوؤں کے باسے میں ایک آدھ شعر سناتی ہے۔ جگنو اور پھر۔ لوگ بیک آواز چلاتے ہیں۔ شکید بانو لطیف سناتی ہے ایک آدمی پچھروں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چادر میں چھپا لیتا ہے۔ پچھر مایوس ہو کر چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رضائی سے سر نکالتا ہے تو ایک جگنو کو اوپر اٹھتے ہوئے دیکھتا ہے غصے سے کہتا ہے۔ چالاک پچھر۔ تم اندھیرے میں مجھے تلاش کرنے کے لیے دیا ہے کرا گئے ہو۔ قہقہے ایک بار پھر بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی دلا دیز حرکت سے لوگوں کو خاموش کراتی ہے اور مومن سون کا نغمہ سننے کے لیے کہتی ہے۔ یہ شکید بانو ہے جمیلہ بانو کے پانچ بچوں میں سب سے بڑی۔ اسے نے یہ فن اپنی ماں سے حاصل کیا ہے۔ لیکن اس کی آواز کا کمر شمع صرف دیوتاؤں کی دین ہے۔ شکید سے بہتر قوالی گانے والے موجود ہیں لیکن کسی کو اتنی خوش بختی حاصل نہیں کہ شکید کی طرح سننے والوں کے دریا موجود ہوں۔

جب نوائیوں بیگمات اور وزارت اعلیٰ کے نام لوگوں کی یادداشت سے نکلی جائیں گے تب لوگ بھوپال کو صرف ایک ہستی کے نام سے یاد رکھیں گے اور وہ ہے بھوپال کی بیٹی شکیدہ بانو۔

ڈی کے پروہا۔ مسکراتا ہوا بدھ

آپ نے چین کا مسکراتا ہوا بدھ تو دیکھا ہو گا۔ وہی زردنٹ، ہیشی آنکھوں والا۔
 منگو لی نقوش، پھولا ہوا پیٹ اور ہسی کا گول گپا۔ یہ ہمیں ہمارے ڈی کے برہما۔
 ایک باتنی آدمی۔ ہر وقت باتیں کرنے والے اور ہر وقت کھانے والا۔ مونگ پھلی
 کھانے کے دوران وہ لطیفے پر لطیفہ سناٹے جاتا ہے جو بہت سے اس کے خلاف ہی ہوتے
 ہیں۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔ تاریخ ادبیات، آرٹ، فن، تعمیر و تہذیب
 اور سیاست اس کی گفتگو کے موضوعات ہیں۔ سیاست پر بہت کم گفتگو کرتا ہے۔ بعض
 اوقات تو مجبوراً سیاست کو چھیڑتا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا سوال پوچھنا چاہیں جو اسے
 پسند نہ ہو تو وہ آپ کی سنی ان سنی کر دینے کا فن چانتا ہے۔ ایک سیاسی کارکن میں شاید
 ہی یہ عجیب و غریب عادتیں موجود ہوں جب اس سے ہمارا تعارف ہوا تو وہ اُسامی
 شاعری پر بحث کرتا تھا۔ ویسے ٹی ایس ایلٹ، ٹیگو، روسیٹی اور ٹینیسن اس کے
 پسندیدہ شاعروں میں ہیں۔ وہ سون براڈن اور براڈ ٹنگ کی شاعری پسند کرتا ہے
 حیرانی کی بات ہے کہ اس نے سولہ سال کی عمر میں نظم مر اکہنی شروع کی اور پھر ۳۰ سال
 کی عمر میں اپنا قلم رکھ دیا۔ سمجھی نہ اٹھانے کے لیے۔ اس کے خاص موضوعات یہ تھے:
 دوسرے تخلیقی فن کاروں کی طرح موت اور وقت۔ ہاں محبت بھی انسانی حقیقت اور
 فلسفیانہ معروضیت۔ اس کی بہترین نظم وہ قرار پاتی جس میں انسانی ارادے اور تقدیر
 کا اختلاف پایا جاتا ہے خدا اور بندے کے درمیان قدیم جھگڑا۔ یہ نظم لکھنے میں
 آدھ گھنٹہ اور مونگ پھلی کے دو برے پیارے صرف ہوئے۔ دوسرے لوگ بھی کس
 سے متعارف ہونے چاہتے تھے لیکن وہ ادھر ادھر کوٹوں کھدروں میں رکوشیاں

کرتا پھرتا تھا۔ ہمارے سیاستدان تاریخ کوٹوں میں سرگوشیاں کرنے میں بڑے راضی
 رہتے ہیں لیکن وہ جلد ہی واپس آگیا اور میرے گھٹنوں پر دوستانہ طور پر ہاتھ جھکتے
 ہوئے بولا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔

اور اب وہ ذات پات پر بحث کر رہا تھا۔ کہ سکھوں کی کوئی ذات نہیں، کھتری
 بھی تھے، تجارت پیشہ بھی، جنگجو، شاعر، فلاسفر اور نہ جانے کیا کچھ۔ کیا سکھوں کے
 دس کے دس گرو کھتری نہیں تھے۔ اور رنجیت سنگھ کے بہترین جرنیل۔ محکم چند
 یوان چند اور۔۔۔ ہی سنگھ نلوہ۔ کچھ اور مونگ پھلیاں اور آخر دت صرف ہو گئے اور
 مجھے انڈیو کے لیے دیا گیا بہت سادہ وقت بھی۔ اب پھر وہ ایک مقامی سیاسی لیڈر
 سے لہسر پھسکے بعد میری طرف آیا اور کہنے لگا۔ اور ملوں تو میں کہہ رہا تھا۔۔۔
 میں نے اس نے بھیسے کو سینک سے پٹرنے کی کوشش۔

س۔۔۔ آپ کی بارڈن کا تاثر بہت غلط ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کر رہے
 ہیں؟ اس نے میرے اس حملے سے اپنے آپ کو دیر سے بچایا۔ بلند آواز سے
 قہقہہ لگایا اور بولا

ج۔۔۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ سیاسی غلط فہمی ہے۔ ہمارا تاثر اتنا خراب نہیں جتنا
 آپ لوگ سمجھتے ہیں ابھی ہمیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہے۔ میں ابھی بہار کے دوسرے
 سے واپس آیا ہوں اور مجھے علم ہے کہ عوام بڑی تعداد میں ہمارے ساتھ ہیں صرف
 پٹنہ جیسے شہروں میں کچھ لوگ جے پی کے ساتھ ہیں۔ دیہاتی علاقوں کے لوگ تو کانگریس
 کے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے اجلاس اور جلسے کوئی کسوٹی نہیں ہیں صرف انتخاب ہی
 سے معلوم ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی رائے کیا ہے۔

س۔۔۔ حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ آپ روپے کے زور پر انتخاب پر اثر انداز ہو رہے ہیں
 ج۔۔۔ دوسری پارٹیوں کے پاس ہم سے زیادہ سرمایہ ہے بی جے پی کے پاس
 جتا ہے۔ بڑے بڑے اخبارات بہت بڑے گئے ہیں۔ سب
 پارٹیوں پر بحثی اثر رہا ہے۔

اس نے مجھے پھر جلسوں اور جلوسوں سے نتیجہ اخذ کرنے پر انقباض کیا پنجاب میں کیا ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ کی آواز پر سینکڑوں ہزاروں لوگ جلسوں میں آئے لیکن دودھ انہوں نے اکالیوں کی بجائے کانگریس کو دیئے۔

وہ جانتا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ بھی کھتری ہے۔ بھاپا۔ اس کی سب سے ہیں لیکن حکومت کے بے موزوں نہیں سمجھتے صرف ایک جاٹ ہی حکومت کے لائق ہے۔ میں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے۔ ذیل سنگھ جاٹ نہیں ہے نہ ہی مسافر لیکن میں اسے اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ پٹری سے اتر کر مذہبی مسائل میں گھر جائے میں نے کانگریس پر اپنا حملہ جاری رکھا۔

میں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے جارج فرنینڈ کا چیلنج کیوں قبول نہ کیا۔ اس نے اپنے پیسے میں پارلیمنٹ کی بے انتہا توہین کی ہے اور کچھ ممبران اسمبلی کو دلال تک کہا ہے کانگریس نے اس کا نوٹس نہ لے کر بیٹھا ہر کیا ہے کہ کچھ تو ہے جس کی پر وہ داری کانگریس کو منظور ہے۔

بروہان نے میری بات کو ایک مختصر اور ذریعہ فخر سے رد کر دیا۔ "نہیں فرنینڈ شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا اور ہم اس کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہتے تھے" اور پھر اس کے کہیں اسے اس مسئلے پر اور زیادہ رگیدتا مگر اس نے کمال ڈھٹائی سے کام لے کر موضوع تبدیل کر دیا۔ "جیسا کہ میں کہہ رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ کسی امیر خاندان کا فرد نہیں ہے۔ اس کا باپ ایک سکول ٹیچر تھا۔ آسام میں بڑی زمینداریاں نہیں ہیں کسی کے پاس بھی چار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں۔ آسامیوں کو دولت کی اتنی پرواہ نہیں۔ زیادہ امیر لوگ روپے پیسے کے بل پر انتخاب نہیں جیت سکتے کیونکہ وہاں دولت کا وقت نہیں خرید سکتی۔

بروہان کوئی ذات نہیں بلکہ ایک قسم کا عہدہ ہے۔ براہمن بڑے اور کھتری بڑے ہیں اور ہاں مسلمان بڑے بھی ہیں۔ قوم کے اعتبار سے میں کالستھبول لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ذاتی ذات پات کے فرق سے فوہدین

مجھ سے بہتر آسامی ہے جب ہندومت اور اسلام آسام میں داخل ہوئے تو مذہب کی گریں بنسیاد مجروح ہو گئیں۔

س۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اسے اس کے مذہبی اعتقادات کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

ج۔ میں مذہبی ذہن نہیں رکھتا۔ میں حقیقت پسند ہوں ہیں مذہبی رسوم کی پابندی نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان کی روایات لبرل ہیں۔ گزشتہ چار سالوں میں میں بنارس میں تھا لیکن میں ایک دفعہ بھی مندر میں نہیں گیا اور نہ ہی اشنان کرنے لگا۔ لیکن مجھے موقع ملا تو میں نجف اور کربلا بھی ہو آیا۔ میں یہ خیال ہے انہوں نے آپ کو کئے میں گھسنے نہیں دیا ہوگا۔

ج۔ اس نے ایک زوردار قبضہ لگایا۔ اور پھر اپنے مخصوص موضوع پر گفتگو کرنے لگا کہ کس طرح کھتری، پوتاپوتوں سے ملتے ہیں۔ سکندر اعظم کس طرح نجات دہندہ ثابت ہوتا ہے۔

س۔ میں اسے پھر بیسویں صدی میں لے آیا۔ اندرا گاندھی کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔

ج۔ اپنے باپ کی مانند وہ بھارت کی مقبول ترین لیڈر ہے۔ منہ گاندھی میں یا کانگریس کے کاموں میں کیڑے نکالنے کا فیشن سا ہو گیا ہے۔ جب میں نے وزارت پٹرولیم و کیمیکل کا انتظام سنبھالا تو لوگوں نے کہا کہ ملک سے باہر کی زندگی بڑے سہجانی ہے۔ میں ملک سے باہر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ جب میں روم میں تھا تو میں پکچر گیلری جانا چاہتا تھا۔ اگر ہڑتال نہ ہو اور عجائب گھر کھلتا ہو تو آپ وہاں جاسکتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے وہاں ہڑتال ہو چکی تھی اور گیلری بند تھی۔

وہ انڈونیشیا، ملائیشیا اور یورپی ممالک میں پیش آئے۔ توقعات کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ میں ایک دفعہ پھر اسے گھر لکھا۔ مملکی صورت حال

کی طرف کھینچ لایا۔

سے: حکمران جماعت کا عوام کے دلوں میں کیا تاثر ہے اور آپ اس سلسلے میں کیا کردار چاہیں گے۔

ج: تاثر کوئی طے شدہ بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک جاری عمل کا نام ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کو خوراک مہیا کرنی ہے۔ اگرچہ زراعت کا کاروبار سبھی شعبے میں ہے تاہم حکومت کو اس سلسلے میں کارروائی کرنا چاہیے اور خوراک محفوظ کرنی چاہیے اور پھر اسے عوام میں تقسیم کرنے کے لیے باقاعدہ تنظیمی سطح پر کام کرنا چاہیے۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ وہ سیاست پر بہت کچھ کہہ چکا ہے۔ اور اس کا احساس ہوتے ہی وہ اپنے محبوب موضوع کی طرف پلٹ آیا۔ کیا تم بھٹو پاپا؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔

نہیں۔ میں کھورانا ہو جیسے ہر گوند تھا جسے نوبل انعام ملا تھا۔ کیا بردہا کاسٹھو میں سے بھی کسی نے نوبل انعام حاصل کیا ہے۔
”بردہا کاسٹھ۔ وہ ہنسی سے دوہرا ہو گیا۔ وہ سب کے سب بے کار لوگ ہیں۔“

بنگلہ دیش کے مجاہدین آزادی

پاکستانی افواج کی بنگالیوں کی نسل کشی کی مہم کے نتیجے میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات کو مکتی فوج کا قیام عمل میں آیا۔ یہ صرف دس ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی لیکن جلد ہی یہ گونہا بنی یعنی عوامی فوج آزادی کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے مسلح مرد و خواتین کی تعداد ایک لاکھ سچاس ہزار سے تجاوز کر گئی اور لاکھوں ابھی اور شامل ہونے کے لیے تیار تھے امن پسند بنگالیوں کی دعووں کو کھیلنے کے لیے یہ نولاد کیسے تیار ہوا۔

۱۲ نومبر کی صبح کو برطانوی جھنڈا ہارلے سات ہزار ٹن وزنی سامان اٹھائے سی آف سینٹ ایل نبر دریا کے نیوگلی کے دہانے سے برآمد ہوا اور کلکتہ کی جانب آیا۔ اس کی فوری دیواروں میں، چھوٹے بڑے سوراخ تھے اوپر سے گرنے لگے۔ اگلے روز ایک مقامی اخبار نے تصویروں سے مصلے کہانی شائع کی جس میں مکتی باہنی کے اس بحری جہاز کو نقصانات پہنچانے پر روشنی ڈالی گئی ریاست کی حکومت نے فوراً اس ایسے پر سوچ بچار کیا کسی فوٹو گرافر کو اس کی تصویریں لینے کی اجازت نہ دی گئی اور صرف ایک سرکاری ہیڈ آؤٹ جاری کیا گیا جس میں یہ بتایا گیا کہ جہاز پر کبھی مشرقی پاکستان کے ساحل پر حملہ کیا گیا ہے

میرے ذہن میں بہت سے سوال ابھرے۔ کیا جہاز سامان کے ساتھ مشرقی پاکستان جارہا تھا۔ سامان کس قسم کا تھا۔ اس پر حملہ کس نیت سے کیا گیا کیا پاکستانی سمندری حدود میں یا بین الاقوامی پانیوں پر حملہ آور کون تھے۔ کیا یہ واقعی مکتی باہنی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر فرض کیا جاتا ہے۔ تو پھر ان کے پاس فوجی بحری کشتی کہاں سے کئی جس کی مدد سے انہوں نے حملہ کیا۔

چار روز بعد میں نے کانٹن ریج کے علاقے میں جانے کا اجازت نامہ حاصل کیا

جہاں جہاز سگر انداز تھا ساحل پر بہت سے مزدور اور کلرک پھر رہے تھے گودی مزدور
جہاز سے مشینری نکال کر یہ عینوں سے اتر رہے تھے اور خوش گیسوں کا تبادلہ کر رہے تھے
میں بھی ان میں شامل ہو کر اپنی خوشی کو چھپتے ہوئے سوراخ گھسنے لگا پھیس میرے
قریب ہی ایک شخص نے زور سے کہا۔ اتنے ہی دوسری جانب بھی ہیں۔ تو بے مکتی باتی
میں نے اس سے پوچھا کہ میں نے یہ کیسے اندازہ لگایا ہے کہ یہ مکتی باہنی کا کام ہے؟
اور کس کا دوسنا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ یہ تو ان کا کام ہے یا ہمارا۔ ان کی فتح ہماری
فتح ہے اور ان کی شکست ہماری شکست ہے۔

کچھ اثر در سوخ اور کچھ کوشش سے میں نے جہاز کے اندر جانے کی اجازت حاصل
کر لی رات گئے میں جہاز کے پتھان ہانس اور اس کی خوب دوست بیوی مندر ز میری
ہانس کے پاس بیٹھا واقعے کی تفصیلات حاصل کر رہا تھا کپتان ایک چیمو شیم سکانش تھا
اور اس واقعے سے اسے جو شہرت حاصل ہوئی اس کا مزہ سے رہا تھا میں گذشتہ ہفتے ایک
برطانوی بیڑے پر تھا میں نے بذات خود کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی میں اس واقعے کے
بارے میں کچھ بتا سکتا ہوں جب تک کہ انٹوٹری ختم نہیں ہو جاتی ہمارا بحری اناشی دہلی
سے پہنچ چکا ہے اور اس نے تمام نقصان کا مشاہدہ کیا ہے جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے
اس سے بہرہ دیا ہے۔ کپتان نے کہا پھر اس نے مجھے بتایا کہ کیا ظاہر ہو چکا ہے سی آف
آل نیو انٹوٹری دیریلے ہی سامان امارے طلک آ یا تھا اور انٹوٹری کو پھیلے پر کوٹنگ اٹھا
لیا گیا اور جہاز فینچ بنکال میں ٹہرتا ہوا شرقی پاکستان کی دوسری بڑی بندرگاہ چالسا
کی طرف روانہ ہوا جہاں سے اسے پٹ سن لادنا تھی تقریباً ایک بجے کوئی کن بوت
یا زیادہ کن بوتس کسی نامعلوم مقام کی طرف سے آئیں اور انہوں نے جہاز کو چھلنی
کمر دیا، دس منٹ کی یہ ایک خوفناک ردا ت تھی۔ روز میری ہانس نے کہا۔ مجھے
اس کا تجربہ جنگ عظیم دوم میں ہو چکا ہے۔ کپتان نے بات جاری رکھی۔ لیکن اگر
کوئی کہے کہ وہ اس واقعے سے خوفزدہ نہیں ہوا تو وہ بہت بڑا جھوٹا ہے میری آنکھوں
سے سامنے تو اندھا اچھا گیا۔ میں نے جہاز کا رخ موڑا اور واپس کھٹنے کی جانب روانہ ہوا

سوراخ سائز میں ایک جتنے ہی میں کیا خیال ہے ایک ہی ہتھیار استعمال کیا
گیا ہے۔ غالباً پام۔ پام۔ میں نے پوچھا
نہیں سوراخ ایک حصے نہیں ہیں۔ کپتان نے کہا۔ بن اسے کام ہر تو نہیں تاہم
اتنا فوری اندازہ ہے کہ اب سے راند متبہر استعمال ہوئے ہیں۔ ہمارے کچھ خواتین
کیے ہیں اور بکری اناشی کو دیئے ہیں۔
"اس سے کوئی نتیجہ نکلا۔"

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔ مجھے توئی الحال کسی پر بھی شبہ نہیں۔"

کرنل محمد عثمانی عثمانی مکتی باہنی کا کامڈر چیف ہے۔ دو پچیس سال کا ایک
دہلا ہوا آدمی ہے، اس کی باہر زنت پر سفید پیتل ہار کی مانند سفید مو پھیں عیب
مکتی ہیں۔ وہ کرنل C.M.P کے انداز میں صاف اور سنسنے انگریزی بولتا ہے اس
کی گفتگو میں اینگلو انڈین مٹری سائنس کی مانند دہ بولتے پکا اور جالی گڈ
کے الفاظ کثرت سے سننے میں آتے ہیں۔ اسے اس اور عثمانی اس کی آنکھوں سے
جھانکتی ہے جو ایک کھنڈ میں ہے اس کے ساتھ گڈار اس میں اسے مسکراتا ہو نہیں
دیکھا اپنی زیرمہ جنگوں اور اپنے جوں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں
بنگمٹا اٹھتی ہیں جب وہ پکنی فوج کے بیٹوں پر غم و غم کی بات کرتا تھا تو اس
کی آنکھوں میں نفرت کا لالہ ہوتا تھا۔

کرنل عثمانی تک پہنچا اس سال نہیں۔ جب بھی اسے بارے میں پوچھا جتنے ایک
ہی روز پتہ ملتا ہے۔ کسی جگہ منگولیش کے اندر ہی ہے۔
مجھے اس کی تصویر میری ٹیبلٹ گمرانی میں سے یاد آگئی۔ وہ ایک سرس پر بڑے
خردار طریقے سے بیٹھا تھا اور ایک گیس پمپ اس کے سر پر دھن کر اس سے اسے
کی میز باکل تنگی تھی اس کی تصویر میری کی دیو میں تصویریں پکینڈ۔ اس سے اسے
تھیں حتیٰ کہ شیخ نجیب الرحمن کی تصویر بھی تھی اس نے بڑی درشتی سے اسے
ساتھ ساتھ ملا یا اور بغیر وقت ضائع کیے پوچھا کہ وہ میرے بیٹے کی کرسی ہے

میں نے سی آف آل ہیز کے بارے میں پوچھا۔ کرنل عثمان نے مجھے کسی انفرادی شخصیت کا نام نہیں بتایا لیکن مہالوں رشید
 ا۔ ایک فیر سچ جہاز پر یا غیر جانب دار رہ کر جس کے بارے میں میں آگاہی تھی۔
 یہ ہمارے پانیوں میں تھا اور بعد ازاں اس سے آیا تھا اور ہمارے دشمن کے ساتھ تجارت
 کر رہا تھا۔ محض ایک جہاز کو نقصان پہنچنے پر دنیا تناؤ اور دیکھ کر رہی ہے۔ یہ لوگ اس وقت
 کہیں تھے جب پاکستانی حملہ آور معصوم قوم کو قتل کی طرح کر رہے تھے۔ ہوں اور
 غور توں قتل عام ہو رہا تھا نہ ہوا تھا۔ اس وقت کسی قوم کو یہ خیال نہ
 آیا کہ ان کو ہر دکانا جائے۔ اس وقت بین الاقوامی اخلاقیات کا یہ سوچا گیا تھا۔
 میں نے جہاز کا ذکر چھوڑنا مناسب سمجھا اور مکتی باہنی کی بنیاد کی طرف آیا

اس کا ٹھکانہ ۲۵ اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو ہوا جب پاکستانی فوج نے
 بنگالیوں کو فرقہ وارانہ دہشت پسند عناصر قرار دے کر ختم کرنے کی مہم شروع کی ان کے مقابلے
 میں ہمارا ارادہ کوئی فوج کھڑی کرنے کا نہیں تھا میں ایک سپاہی ہوں اور میں اس اذیت
 پر عمل کرتا ہوں کہ فوج کو سیاست میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات میں نے پہلے کسی
 کو نہیں بتائی جو آپ کو تیار رہا ہوں۔ ۱۹ مارچ کی شب جب ہوا فواہ ملی کہ پاکستان افواج
 بنگالیوں کا قمع قمع کرنے والی ہیں تو شیخ مجیب الرحمن نے مجھے سینئر بنگالی افسروں کے
 ساتھ رابطہ پیدا کرنے کو کہا تاکہ یہ قسم کی ذیادتی کاہلہ لینے کے لیے تیار رہا جائے میں نے
 ایک با اعتماد سپاہی میجر خالد شرف کے ذریعے ایک خفیہ سرکلر ان افسروں کو بھیجا میں نے
 بین الاقوامی نکات پیش کئے۔

۱۔ سیاست میں ملوث نہ ہوں۔

۲۔ کسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں۔

۳۔ جادیت کا جواب سرکوبی سے دیں۔

اگر پاکستانیوں کی سرکوبی کا مقصد بنگالی سیاستدانوں تک ہوتا تو بنگالی افواج
 غیر جانب دار رہتے۔ لیکن جب ہمیں معلوم ہوا کہ ہر قابل بنگالی اور سینئر فیسر کو ختم کرنے کا
 منصوبہ بنایا گیا ہے تو پھر ہم نے پاکستانی فوج پر مشتمل مکتی باہنی بنائی۔ اس طرح ہم نے

انقلاب دے کر نل عثمان نے مجھے کسی انفرادی شخصیت کا نام نہیں بتایا لیکن مہالوں رشید
 چوہدری جو آئو بر، دہلی میں پاکستان کا ڈپٹی ہائی کمشنر رہا اور پھر جگہ دیش بھی اس نے
 مجھے بتایا کہ فوجی کارروائی سے کئی ہفتے پہلے سینئر بنگالی افسروں کو تہہ مل کر دیا گیا تھا یا ان
 کو بہتر اہم جگہوں پر تعینات کر کے جو انوں کے ہاتھ میں کمان دے دی گئی تھی۔ میجر عثمان
 چوہدری، میجر خالد شرف، کو میلا اور میجر ضیاء کو کہیں چٹا گنگ کے اس پاس تعینات کیا
 گیا۔ بنگالی فوجیوں اور پولیس کے سپاہیوں نے ان نوجوان افسروں کو اپنا آقا تسلیم کیا اور
 اس طرح تقریباً دس ہزار تربیت شدہ افراد کی ایک فوج تیار ہو گئی ان لوگوں نے کرنل
 عثمانی کو اپنا کمانڈر انچیف مقرر کیا جو پہلے ہی عوامی لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کی رکنیت
 حاصل کر چکے تھے۔

مکتی باہنی کے کئی گروپ تھے۔ ان کی سیاسی قیادت شیخ مجیب الرحمن کی عوامی پارٹی
 کے ممبران کرتے تھے ان میں سے بیشتر چالیس اور پچاس کے دھاکوں میں تھے اور اگرچہ
 ان میں ہتھیار اٹھانے کی سکت نہیں تھی تاہم لوگوں نے ان کو حوصلہ دے رکھا تھا وہ
 دسمبر ۷۱ء کے انتخاب میں قومی اسمبلی کے لیے ۱۶۹ میں ۱۶۷ نشستیں جیت چکے تھے۔
 فوجی گروپ میں ایٹ بنگال رجمنٹ، ایٹ پاکستان رائفزز پولیس، انصار اور
 مجاہدین پر مشتمل تھا۔ ۱۶ مارچ کے قتل عام میں یہ دس ہزار جوان پانچ سو سے زیادہ فوجی
 دستہ غیر سیاسی تھا۔ ان میں سے بہت سوں کو اپنے ہی رنچ تھے مثلاً بنگالیوں کے
 مقابلے میں دوسرے لوگوں کو ترقی دینے کا رنچ۔ زیادتیوں اور جبر کا رنچ، اگر پاکستانی
 فوج انہیں نہ چھڑتی تو شاید یہ بھی اگے ہی جاتے۔

یہ سرگروپ دھاکوں پر مشتمل تھا جو لوگ جسمانی طور پر اس قابل نہیں تھے انہوں
 نے اگے گروپ بنایا۔ اس میں اکثر بے سکول اور یونیورسٹی کے طالب علموں کی تھی
 جن کی عمریں پندرہ سے بیس سال کے درمیان تھیں۔

اس گروپ پر سیاسی نظریات نے نہ اثر دکھایا دو کمیونسٹ پارٹیاں تھیں
 سینکڑوں نواز پارٹی کے لیڈر بھاشانی تھے اور ماسکونو، پارٹی مظہر گروپ بھاشانی تھے۔

فیکر لوں میں نام کر نے دے مزدور بھی اپنی اپنی ٹریڈ یونین کے حوالے سے ان پارٹیوں میں شامل تھے اگست ۱۹۷۰ء میں بایئیں بازو کے اتحاد کی کوشش کی گئی اور کوآرڈی نے ٹنگ کیٹی آف یفٹ یا سی سی ایل کی تشکیل دی گئی۔

مزید ایک گروپ طالب علم رہنماؤں اور ان کے پیروکاروں پر مشتمل وجود میں آیا۔ ان کے دو واضح طالب علم لیڈر تھے۔ حفیظ احمد اور فضل الحق مرنی، انہوں نے زیادہ اچھی اور بہتر فوجی تربیت حاصل کر رکھی تھی اور جنگل دیش میں ان کی حیثیت ایک طاقت کی مانند مانی جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو حبیب باہنی کہتے تھے۔ میں مکتی باہنی کی صحیح تعداد کا اندازہ کھانے میں ناکام رہا۔ کرنل عثمانی نے اعداد و شمار بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں اسے گو نو باہنی یعنی عوامی فوج آزادی کہتے ہوں کیونکہ ہر جنگالی ایک سپاہی ہے۔ کرنل عثمانی نے کہا بہت سے سرکاری محنتوں کے مطابق یہ تعداد پچاس سے ساٹھ ہزار کے درمیان تھی جو یکے ایک ایک لکھ پچاس ہزار ہو گئی پیسے ہیں یہ صرف اور نہ صرف مسلمان فوج تھی بعد میں تقریباً تین ہزار ہندو جنگالی اس میں شامل ہو گئے۔

ہو سکتا ہے کہ جنگالی صحیح پیمانہ پر مارشال نہ ہو سکے ہوں لیکن انہوں نے ہم بازی باؤ اور ہسپتال کے استعمال میں اپنا فطری رجحان ثابت کیا جسطافی راج کے دوران جنگالیوں نے ہندوؤں کی نسبت کہیں زیادہ ہرجا ہرجا کر دہشت گردی کے ذریعے قتل کیا تھا اور ان میں سے بہت سوں کا تعلق مشرقی پاکستان یا جنگل دیش کے موجودہ علاقوں سے تھا کسی باقاعدہ گن مین یا ہم باز کو مکمل طور پر گوریل بنانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

مغربی پاکستان کی پنجابی اور پنجاب حکومتوں نے جنگالیوں کے خلاف اکیلا زور دکھا۔ انہوں نے ایسٹ بنگال رجمنٹ اور آرمڈ کانسٹیبلری کا کچھ کچھ خیال نہ کیا اور بہت ہی کم جنگالیوں کو اعلیٰ عہدوں پر ترقی دی۔

۱۹۷۰ء تک صرف ایک لیفٹیننٹ جنرل تھا کسی جنگالی کو نیوی یا ایئر فورس میں مغربی پاکستان کے مطابق رینک نصیب نہ ہوا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے ایک پنجابی پاکستانی دوست سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مشرقی علاقے کی آبادی کل آبادی کا ۵۶ فیصد ہے۔

لیکن فوج میں صرف سات فیصد افراد کیوں ہیں تو اس نے ناک سیکڑتے ہوئے نفرت سے کہا یہ دال بھات کھانے دے لوگ لڑنا کیا جانیں۔ فوج کوئی پھیروں کا گلہ نہیں ہوگی۔

معظم چوہدری جس کا تعلق سہت سے تھا اور جو شیخ مجیب الرحمن کا دوست تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بنگالی فوجیوں نے اپنے آپ کو فو لا دیسے بنایا۔ تم جانتے ہو کہ ہم اس پسند لوگ ہیں ان پنجابیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کی درندگی نے ہمیں لڑنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کی پردہ اندکی ایک ذلیل سے ذلیل جانور اپنے گلے اور اپنے خاندان کی حفاظت کرتا ہے۔ نفرت لوگوں کو لڑائی پر مجبور کرتی ہے۔ یقیناً جنگل دیشیوں کے ذہنوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

اپنے ان امریکی دوستوں کو بتا دینا۔ کرنل عثمانی نے کہا کہ جو کچھ پاکستانی فوج نے ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو کیا وہ سو LAIS MY کے بھی زیادہ ہے جب تک ہم ان کا صفایا نہیں کر لیتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے ان کی لاشیں جنگل دیش میں ذلیل ہوں گی اور ہم ان کے پھوت مغربی پاکستان بھیجیں گے مجاہدین آزادی تعداد اور فوجی استعداد میں ترقی کرتے گئے۔ دو ماہ کے بعد اس کا نام مکتی فوج سے تبدیل کر کے مکتی باہنی (تنظیم) کر دیا گیا اس تنظیم کا دائرہ کار اتنا وسیع تھا کہ ہر شخص گوریل کی مانند جہازوں، کشتیوں اور دریاؤں کے پلوں کو تباہ کر سکتا تھا۔ گروپ کیپٹن خوندکار، جنگل دیش ایئر فورس کا ایئر مارشل مقرر کیا گیا۔ اگرچہ ان کے پاس بہت کم پائمنٹ تھے تاہم ان کا کوئی جہاز بھی اپنے ہنگر میں نہیں تھا۔

مشرقی پاکستان اور بھارت کے باؤر کے ساتھ مکتی باہنی کے ہی ٹریڈ گروپ تھے۔ بغاوت کی خاطر اس سبب کے نام کبھی نہیں بتائے گئے اور صرف جواب دہ سے کہ جنگل دیش کے اندر کسی جگہ۔ اسی طرح تربیت و تنظیم کو بھی غور رکھا گیا۔ اس آپ کچھ ہیں کہ دہشت نام میں وہ یا تنظیم کی تربیت بھی ایسے نہیں کی تھی جنہوں نے

عثمانی نے کہا پہلے پہل میں نے اپنی فوج کو ردائی فوجی ٹاس کی تربیت دی اور ہم ردائی فوجی ٹرائی ٹرے ہمارا خیال تھا کہ غیر ملکی مداخلت کی وجہ سے یہ ٹرائی ترک جانے کی اور پاکستانی فوجوں کو واپس جانے کے لیے کہا جائے گا لیکن جب ایسا نہ ہوا اور پاکستانی فوج کی تعداد اسی مزار ہوئی جن کے پاس ٹینک، بھاری توپیں اور ہتھیار توپیں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی۔ ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کو میں نے اپنی فوج کی تنظیم نو کی اور انہیں گوریلا ٹرائی کی تربیت دی ہمیں زمین کی ضرورت تھی اور ہم نے اپنے محلی لغوں کو شکست دے کر مجبور کر دیا کہ وہ دیہاتوں کی طرف بکھر جائیں۔ ہم نے ان کے ذرائع رسل و وسائل ختم کر دیئے۔ انہیں دہشت زدہ کر دیا۔ ہم ہر روز ایک سو کے قریب لوگوں کو مار رہے تھے اور ان کے جہاز کفنوں سے بھرے ہوئے واپس جلتے تھے۔ ابھی کل ہی میرے ایک کمانڈر نے کامیاب جیسے کے بعد کوئٹہ سے چینی اور امریکی ساخت کا اسلحہ حاصل کیا ہے۔

ٹریننگ کیمپ میں ملاتی لڑکوں کو صرف انڈر وپر پانگی میں وردش کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ان لڑکوں کے ہاتھ میں ککڑی کی بندوبس ہیں۔ اصل ہتھیار کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں جب ان سے پوچھا جاتا کہ یہ اسلحہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا تو جواب ملتا کہ دشمن سے یا پھر سپاہی اور فوجی بغاوت کے بعد اپنے ہیر کوں سے یا پھر اپنے ہیر کوں دوستوں سے بھی خرید لیا ہے۔ وہ کہتے۔

جب میں نے کرنل عثمانی سے پوچھا کہ آبی بارودی سرنگیں اور فوجی گن بوت بکڑی میں کہاں سے آئیں تو اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تربیت کا عرصہ چند ہفتوں سے چھ ماہ تک کام کی نوعیت کے مطابق پھیلا ہوتا تھا کسی گاڑی کو بڑی سی سے اتارنا یا سڑک پر بارودی سرنگ لگانا۔ بہت آسانی سے لیکھ جاسکتا ہے ایک مارٹر یا تین چیلنے کی تربیت یا پانی کے نیچے تیرے ہوئے بارودی سرنگیں بچھنا نازہ مشکل اور حریفانہ کام ہے۔

یعنی اس کی فتح کے دعویٰ کی تصدیق سب سے کرنل عثمانی نے کیا۔

ستمبر ۱۹۷۱ء تک ہم پچیس ہزار پاکستانی سپاہی قتل کر چکے تھے۔ اکیس جہاز ڈبو دیئے اور ۶۰۰۰ دریاؤں کے پل مکمل طور پر تباہ کر دیئے۔ ریل کی پٹریاں اتار دیں۔ سڑک، دریا، پل، پیر و پیر، مسجد کو تباہ کر دیا۔ آپ خود تصدیق کر سکتے ہیں۔ جنگ دیش میں صرف چند گاڑیاں چل سکتی تھیں اور چالان کی بندرگاہ مکمل طور پر بند تھی۔

بھارت کی دفاعی ضروریات کی تعلیم ماہ ۱۹۷۱ء کے آخری حصے کے مطابق جنگ دیش میں قتل ہونے والے پاکستانیوں کی تعداد ۶۰۰۰ کے قریب ہے۔ حکومت پاکستان کی کمی یا جی کے خلاف نشری مہم فوری جنگ دیش ریڈیو اور طلعت سے نالغ ہونے والے ایک اخبار کی بنا پر دب کر رہ گئی۔ حال احوال سے دو باختم ادارے ضرور موجود تھے جہازوں پر موجود بھارتی عہدہ جوشہ فی پاکستان سے آیا تھا۔ یہ ملکی ریڈیو بی وی اور اخبار سے نامزد جنہیں بلا تلفظ ڈھاکہ کے سے باہر جا کر حالات کا خود یہ نہ ہونے کی اجازت تھی بنگالی بکری ٹکے کے پاس جہازوں کے تباہ ہونے کی بے شمار کہانیاں تھیں ستمبر ۱۹۷۱ء کے تبصرے ہفتے میں سو ہزار ٹن ذرنی برن فوئی ٹینکر T-401 BAN کو پناہ کی بندرگاہ پر بے اندازہ نقصان ہوا۔ اس کے فوراً بعد ایک دس ہزار ٹن ذرنی برن فوئی جہاز "چاکر نیا" تباہ ہو کر کلکتہ کی بندرگاہ پر بمبارت کے سے جہاز ان لوگوں نے بی پاکستانی سپر مارٹر کو شٹل ٹینکر بندرگاہوں پر لٹے پڑے کوئی صورت میں دیکھے۔ ۱۳ اگست یعنی پاکستان کے یوم آزادی پر ۱۹۷۱ء ۱۰۰۰ ہرجا کاٹک میں کیا گیا۔

کنویر۔ نومبر ۱۹۷۱ء کے دوران بانی پاکستان کے کمانڈر نے اپنی سربراہی میں ۵ اکتوبر کے روز مغربی پاکستان کے قتل ہونے والے ڈھاکہ کے مرکزی حبیب بینک میں بم کا دھماکہ ہوا۔ اس سحرت میں ورلڈ بینک کا ایک دفتر بھی واقع تھا جس کے دشمنوں کو نقصان پہنچا۔ اور ایک پتہ سن کا ٹورم جیل کر رکھ ہو گیا۔ بھارت میں خود کشوں کے مطابق زمانہ دامن میں ہندو دشمن ذرائع نقل و حمل ۸۵ فیصد میں کے دس ۸۵ فیصد سڑک کے ذریعے تھے موجودہ سال میں ۸۵ فیصد سے کم رہا۔ خود کشوں نے سب سے پہلے پاکستان کی سب سے بڑی

سنت تھی۔ اس کی نقل محل قلیوں کے ذریعے ہوئی تھی سنتی پیداوار عام حالات سے
۵۵ فیصد کم ہو گئی۔ تمباکو کی پیداوار دس فیصد کم ہو گئی چائے کے گیارہ باغ جو مرحہ
کے قریب تھے بند ہو گئے باقی کی پیداوار میں ۲۵ فیصد کمی ہو گئی۔ یہ سب مکتی باہنی کو تیا
گیا تھا جس کے بارے میں ڈھاکہ کے پاکستان بزرگ کا خیال تھا کہ یہ موت اور تمباہی کی
ایک بے رحم تنظیم ہے جو ملک میں افراتفری مچا رہی ہے اور بالو سی اور بے یقینی کے
حالات پیدا کر رہی ہے۔

بنگلہ دیشی کمانڈوز کی فتح ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ بھارتی صحافیوں اور فوٹو
گرافروں کو بالآخر بنگلہ دیش کے باہر اکٹھا کر لیتے تھے اور مدعو کرتے تھے۔

میری آخری ملاقات اس وقت کے وزیر خارجہ رنکھ دیش کے (خوندار مشتاق
احمد سے ہوئی۔ جب میں اس کے بی اے کے کمرے میں پہنچا تو یہ ملاقاتیوں سے بھرا
ہوا تھا۔ ایک کونے میں سوویت می میوں کی ایک ٹیم کو بنگلہ دیش کے بارے میں تفصیلات
بتانی جا رہی تھیں۔ نقشے کی مدد سے بتایا جا رہا تھا کہ مکتی باہنی کس کس علاقے پر قبضہ کر چکی
ہے بنگلہ دیش کے نقشے میں کیا ہے پاکستانی فوج کہاں میرے۔ ترجمان سوال کا مطلب
بتا رہا تھا۔

بھج اور درست علم تو ابھی مشکل ہے۔ ترجمان نے کہا۔ جہاں پاکستانی فوج
فی الحقیقت موجود ہے وہ جوتان کے پاس سے اور باقی کا علاقہ ہمارے قبضہ میں ہے
رات کو وہ تمام بیرونی علاقے جوتان میں وہ سوتے ہیں ہمارے جوتان ان
کے ساتھ جرمہ رست متعلقہ ہیں کر سکتے۔ ان کے پاس ٹینک ورسارے ہیں جیکہ ہمارے
خونوں کے پاس جوتان کے قبضہ گریڈ اسٹین یا مشین گن ہیں جو بھی جوتان کے پاس اسلحے
کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے ان کا مقابلہ کھیس میدان میں نہیں ہے اور اس میں زیادہ دیر
نہیں لگے گی۔

جوتان جوتان سوویت پارٹی کے لیڈر نے ایک فتنہ سی تو فری کی اور کہا کہ
بہداری میں قتل نہ حال فتح حاصل ہو گی بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملانے اور جھک کر

کر رہے۔ بنگالہ کے بعد روسی طاقتور بنے بنگلہ دیش کے نعرے لگانا ہوا چلا گیا۔
خوندار مشتاق احمد بڑا خوش لباس آدمی ہے وہ بنگلہ دیش کی کابینہ کا سب سے با اثر
ذریعہ ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے لیے سنگھٹ رول کر رہا تھا
یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ میں نے اسے یاد کرایا۔ آپ روزے سے نہیں۔ وہ مسکرایا
مجھے معلوم ہے اور شب برات بھی آج ہے لیکن جہاد کے دوران روزے کی معافی ہے یہ
ہماری جنگ آزادی جہاد ہے۔

ہم دیر تک بنگلہ دیش کے بارے میں فیئر مکی رد عمل پر باتیں کرتے رہے اس نے میرے
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور کہنے لگا۔ میرے دوست! ہم کبھی نہیں بولیں گے کہ بھارت
نے آزمائش کی اس گھڑی میں ہمارے لئے کیا کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے دس
ملین بھارت میں پناہ گزین ہیں اور بھارت انہیں خوراک اور دیگر چیزیں مہیا کر رہا
ہے آزاد بنگلہ دیش دائمی دوستی کے معاہدے کی صورت میں یہ قرض اٹا رہے گا۔
قوموں کی یادداشت زیادہ تیز نہیں ہوا کرتی۔ میں نے کہا وزیر خارجہ ششدر رہ
گ پھر بولا۔ کیا امریکہ نے اپنی آزادی کی جنگ کے دوران فرانس کی مدد بھلا دی ہے؟
نہیں ہم اپنے دوست بھارت کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ اس کا مطلب خود اپنے آپ کو
بھلا دینا ہو گا۔

نرا چودھری

”میں سچ دس بجے آ جاؤ۔“ مجھے توقع نہیں تھی کہ نرا چودھری سے اتنی آسانی سے امر دیو کا وقت مل جائے گا وہ نوجوانوں کی ایک دعوت میں تھا۔ وہ اسے تنگ کر رہے تھے لیکن وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لڑکے اس کی جنس کے بارے کتاب THE CONTINENT OF CIRCE سے ریفرنس کے بارے پوچھ رہے تھے وہ نہایت جوشیلے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ نام اطراف میں گردش کر رہے تھے اس کی نازک سبسم اوپر پیچھے جھلٹک لگا رہا تھا ایک لڑکی پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ لڑکیوں کے ملازمت کرنے کے خلاف کیوں ہے۔ ہر خاندان کو مذہب لوگوں کی طرح ایک ہی کانٹے والے کا محتاج ہونا چاہتے ہیں عورتوں کو وہ کام کرنا چاہیے جو قوم کے مستقبل کے لیے ضروری ہے۔ ایک مذہب بگڑے ہوئے زندگی اور بچوں کی خود افزائش اور تعلیم و تربیت۔ ایک مذہب قوم کے لیے عورتوں کے لیے کمائی کرنے سے زیادہ ہی کام اہم ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہندوستانی قوم کا قدیم اشٹا فنیہ کا نظریہ کیا تھا۔؟ اعلیٰ ترین مرد بے پناہ محبت کرتا ہے اور بے پناہ بہادر ہوتا ہے اور اعلیٰ ترین عورت صرف بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اور میں اس سے بالکل متفق ہوں۔“

اس کے جواب میں گہری خاموشی ہوتی ہے۔ ذرا زیادہ عمر کے لوگ جو ذرا قاصد پر کھڑے ہیں آخری الفاظ سنتے ہیں۔ وہ اسے غصے کی نظروں سے دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں کہ یہ بوڑھا بھاری نوجوان نسل کو خراب کرتا ہے۔

لیکن جوان لڑکی بھند ہے۔ درجہ دی بان چھوڑنے والی نہیں۔ ”نرا چودھری آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا آپ متضاد بات نہیں کر رہے۔ میں نے آپ کا ایک آرٹیکل

پڑھا تھا جس میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ مرد کی نسبت ہندوستانی عورت زیادہ مہذب ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر عورت صرف محبت کے لیے مخصوص کیوں ہو۔“

ایک شریر مسکراہٹ اُسکے لبوں پر آتی ہے۔ اسے اس بات پر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ لوگ اسے غور سے پڑھتے ہیں لیکن وہ محض زور ہوتے ہوئے بھی نہیں ہارتا۔

”کیا تمہیں علم ہے شادی کے وقت میں نے اپنی بیوی سے کیا کہا تھا۔؟ میں اس سے زیادہ ذہانت رکھتا ہوں۔ میں بہانہ بازی برواشت نہیں کر سکتا خاص طور پر ذہنی بہانہ بازی وہ بھی عورت کی جانب سے۔ عورتیں ان معاملات میں مردوں کی نسبت زیادہ غیر بخیدہ ہوتی ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتوں کی تعلیم کم ہو اگر کوئی عورت تعلیم حاصل کرے تو وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ ہی زیادہ باشعور اور محال کو سمجھنے والی گردانتی ہے۔ لیکن۔۔۔ تم ذرا مختلف ہو۔ جوان لڑکیاں بہر حال کم حساس نہیں ہوتیں فرض کرو اگر خاوند مر جاتا ہے اور بھارت میں بیوہ کے لیے دوبارہ شادی کرنا ممکن نہیں تو پھر وہ اپنے بچوں اور اپنی زندگی کے لیے کیا کرے۔“

نرا چودھری ہنس رہا ہے۔ اتنی بخیدہ نہ ہوتے۔ وہ ایک امریکن کی طرف رخ مڑتا ہے۔ عورتوں کا کام کرنا جس طرح کہ وہ تمہارے معاشرے میں آتی ہیں صدیوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ وہ فوراً موضوع تبدیل کرتا ہے۔ جانتے ہو کل میں نے امریکی طبیب سے کیا کہا۔ میں نے کہا کہ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ کیونکہ میں اپنے مستقبل کے رہنماؤں سے خطاب کرنے آیا ہوں تمہیں معلوم ہے دہلی میں امریکی سفارت خانہ واپٹ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ امریکی شرم سے مسکراتا ہے۔

ہندوستانی صرف جبر کی حالت میں محنت کرتے ہیں۔ بالکل اس طرح جس طرح انگریزوں نے ہم سے محنت کروائی اور ہمارا پس من جو بہر حاصل کیا۔ امریکی بھی آئینہ چھپس سے چالیس سال کے دوران ہی کریں گے۔ تہذیب ہندوستان میں دوبارہ رائج ہوگی لیکن اس کے آلات ہمارے نہیں ہوں گے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ۱۹۴۰ء کا دفعہ ہمارے لیے بیک بڑی خوش قسمتی تھی زیادہ ترقی میں اس سے نااہل ہی رہتی ہیں

ہم نے بیس سال نسل کر دیتے ہیں اور اب امریکیوں کا آنا گریز ہے یہ مایوس نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور میں اس کا استقبال کروں گا کیونکہ اسی میں قوم کی بقاء ہے۔
 کیا ہم خود کچھ نہیں کر سکتے۔ کوئی پوچھتا ہے۔

نہیں۔ ہندوستان کے ہر دس میں سے نو افراد کوئی پیداواری کام نہیں کرتے وہ سب طفیلی ہیں۔ وہ معاشرے سے باہر رہتے ہیں۔ کلکتہ میں مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا کلکتہ کا کوئی مستقبل ہے؟ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ سوائے اس کے کہ آدھی سے زیادہ آبادی شہر سے باہر نکل کر گاؤں میں جا کر کام کرے کلکتے کی تباہی کا بڑا باعث بنگالی ایشیائی جنس کی سست رفتاری اور صرف تنخواہ کھانے کا رویہ ہے اگر آپ کسی بنگالی یا ہندو کو کہیں کہ آپ اس کے بے ملازمت ہیا کر رہے ہیں تو وہ فوراً معاوضے اور کام کے اوقات کا تناسب سوچنا شروع کر دے گا۔ وہ غالباً ایسی ملازمت بہتر سمجھے گا جہاں پیسہ نسبتاً زیادہ اور کام کم ہوگا۔

دعوت اختتام کے قریب ہے لیکن نرادر چوہدری کے پرستار ابھی تک سوالات پوچھنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے جرات مندانہ نقطہ نظر کی تعریف کرتے ہیں اس کے سنی انداز کو پسند کرتے ہیں وہ فرد فخر ہے اس کے اندر ہمارے دوسرے بزرگ لیڈروں کی طرح معذرت خواہانہ انداز ہیں۔ وہ نوجوانوں سے گفتگو کے دوران ایسا شعلہ پیدا کرتا ہے جو جوانوں اور بزرگوں کی عمروں کے فرق کو مٹا دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کے تمام دوست تیس سال سے کم عمر کے ہیں اور جو لوگ اس سے بڑی عمر کے ہیں وہ اس کے دوست اس وقت بنے تھے جب ان کی عمریں تیس سال سے کم تھیں ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے۔

ایک لحاظ سے نوجوان نسل نرادر چوہدری پر رشک کرتی ہے۔ نرادر چوہدری ناراض نوجوان نسل کے افراد میں ناراضی بوڑھا آدمی ہے۔ اگلے روز میں اس سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں وہی کے پرانے شہر کی دیواروں کے ساتھ کھڑی رہا۔ وہاں پر پہنچتا ہوں۔ تم میری کھڑکی میں سے جوں کا توں دیکھ سکتے ہو۔ وہ کہا کرتا تھا۔ میرا

خیال تھا کہ اس کا گھر دریا کے کنارے ہوگا۔ اس کی بجائے میں نے اپنے آپ کو غلط علاقے میں لوگوں سے گھیرا ہوا پایا۔ غالباً میں غلط سمت میں آ نکلتا تھا۔

قریب ہی مجھے پنجاب روڈ وینز کا بورڈ نظر آیا۔ میں ایک سکھ سے جو قریب ہی ایک کار کی مرمت میں مصروف ہے نرادر چوہدری کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سکھ اس نام سے واقف نہیں۔ پھر میں اسے بتاتا ہوں کہ وہ ایک مشہور کھاری ہے اور اس کا حلیہ وغیرہ بتاتا ہوں۔ ایک کھالی سی ہنسی اس کے چہرے پر آتی ہے وہ بنگالی بابو۔ جھوٹا سا، سوکھا ہوا۔ ہاں ہاں۔ وہ سڑک کی دوسری جانب ایک گھر کی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا نام جانی داکر ہے۔ ایک شریر بچے کی آواز آتی ہے مجھے بعد میں پتہ چلا کہ نرادر چوہدری کا نیک تیم اس علاقے میں جانی داکر تھا۔

کیا تم تھوڑا سا پیر لینا پسند کر دے۔ فرانس سے درآمد شدہ طیارے کے ذریعے یہ دونوں میں یہاں پہنچتا ہے لیکن تین دن کشم دے لگاتے ہیں۔ میرے پاس کچھ دوا کاغذی ہے پوش دار کا۔ یہ روسی دوا کا ہے بہتر ہے۔ وہ مجھے اپنے شراب خانے میں لے جاتا ہے۔ وہاں دُن پیرٹ اور شراب کی بے شمار قسمیں ہیں وہ ایک بوتل اٹھاتا ہے۔ شاید تو لاٹور۔ دنیا کی بہترین شرابوں میں سے ایک۔ ۱۹۵۲۔ ایک اچھا سال ہے۔

وہ ایک خوبصورت مجلس میں داد کا انڈیلتا ہے۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں وہ ایک اور بوتل اٹھاتا ہے اپنی انگلی سے اس کا گلا اڑاتا ہے اور اسے میرے کان کے قریب لاتا ہے۔ سنو۔ کسی خالص آواز ہے۔

جھوٹا سا کمرہ کتابوں سے تاپڑا ہے۔ کچھ جرمن کتابیں بھی ہیں۔ میں ایک دن میں صرف تین گھنٹے لکھنے میں گزارتا ہوں۔ باقی وقت میں پڑھنے، سیر کرنے یا موسیقی سننے میں گزارتا ہوں۔ میری نگرانی بہت اعلیٰ اور قیمتی THORENS سیریلو یکارڈ پرنٹری سسٹم کے ساتھ ہی ایک قدیم لائبریری کے سامنے فون بھی رکھتا ہے۔

نوجوان کے علاوہ زیادہ لوگ مجھے ملنے نہیں آتے۔ یہ ایک غریب اور پامادہ

علاقہ ہے اور شاید لوگ یہاں آتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں لیکن میرے گھر
نے باہر اکثر اوقات بڑی بڑی C.D. کاریں کھڑی ہوتی ہیں۔ وہ غر سے کہنا ہے۔
میں غیر ملکیوں سے زیادہ اچھی طرح کس آپ ہوتا ہوں۔ ہندوستانی ان کی نسبت کم
ایمز جوتے ہیں۔ اس کے یہ ریمارکس میری سانس بند کرنے کے لیے کافی تھے اسے
بلاشبہ امارت پرستی کہا جاسکتا ہے لیکن امارت پسند تو ایسے لغتگو نہیں کرتے۔

قریب ہی شادی کا ایک دعوت نامہ رکھا ہے۔ وہ محسوس کر لیتا ہے کہ جس اسے دیکھ
رہا ہوں۔ میں یہ نہ بتا دیتا ہوں۔ میں وہاں جانا نہیں شادی کے موقع پر
ہزاروں کا تقسیم کمن ایک قسم کا اجتماع کام ہے لوگ ان بہانوں کے آگے حوراک البے
پھینکتے ہیں جیسے کتوں کے آگے۔ اور پھر امیر، بااثر اور غریب بہانوں میں تمیز روا رکھنا
اس سے بھی بالاتر بات ہے۔

کیا ہمارے راجنا اس قسم کی باتوں کی جو سدا افزائی نہیں کرتے۔ میں پوچھنا ہوتا
"کیا تم جانتے ہو کہ دعوت نامے میں اصل مضمون کیا ہوتا ہے۔ نواں نواں بار بار ہے
اور بریکٹ میں کچھ دفعتی وزیر بھی متوقع ہیں۔"

"اگرچہ ہم اپنے آپ کو روحانی کہتے ہیں لیکن کیا ہم سب سے بڑھ کر عدم تحفظ کے
شکار نہیں۔ میں پوچھنا ہوں۔"

ہندوستانی قوم بہت بڑی طرح عدم تحفظ کی سوچ کا شکار ہے۔ تم کرائے کے مکان
ن کیوں رہتے ہو۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ لیکن میں کرائے کی دنیا میں رہتا ہوں میں جواب
دیتا ہوں ہندوستانی لوگوں کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں روئے زمین پر ان سے
نہ زیادہ مادہ پرست اور کوئی نہیں۔ ہندوستانی بہانوں میں حتیٰ کہ سنسکرت میں بھی روحانیت
کے بے کوئی لغو نہیں۔ کیا نہیں پتہ ہے۔ ہم نے ایک لفظ ادھیاتما لکھ لیا
لیکن وہ بھی انگریزوں کے آنے پر۔

وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہندوستان صدیوں تک افسرانہ فرائض اور مذہنی کا شکار رہا ہے
اگر کبھی تھوڑی دیر کے لیے امن کا دور آیا بھی تو لوگوں نے یہی سوچا کہ کسی نہ کسی طریقے

سے دل بنایا جائے معلوم نہیں یہ اچھا دور کب تک رہے۔ ابک اور وجہ بھی ہے۔
نوتی کی۔ جن ٹورے پاس زیادہ قوت نہیں انہیں اپنے تحفظ کی خاطر اٹھنا ہے
کی بھی کوئی شبہ بھی اپنی غذا ہے اس میں فکر مند ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ جب چاہے
سنا کر سے غذا اس سل بر سکنا ہے ابنا اعتماد کسی بھی ہندوستانی کے نصیب میں نہیں
کر ہم نے ہی مادہ پرست ہیں تو پھر مغرب کے بعض لوگ بھارت میں کشش
کیوں محسوس کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔

انہوں نے ہندی میں سب سے پہلے برمنوں نے ہندوستان کو ایک روحانی قوم
سمجھنے کی غلطی کی یہ خیال مغرب کی دنیا میں چھایا ہوا ہے۔ مغربی اقوام اپنی اقدار کھو
چکی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ یہاں سے کچھ حاصل کر سکیں گی۔ جب وہ یہاں آتے
ہیں تو حقیقت حل دیکھ کر حیران و پریشان واپس چلے جاتے ہیں ہمیشہ آپ کو پڑی سے
اترے ہوئے لوگ سکون بخش کرتے ہوئے نظر آئیں گے کچھ نشہ آور چیزوں کے لیے
آتے ہیں اور کچھ جنسی آسودگی کی تلاش میں جو کہ ہندوستان میں وجود ہی نہیں رکھتی
ہندوستان میکس کے لحاظ سے دنیا کا اندر ترین ملک ہے۔

"گو یا ہمارے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔"

ہماری تہذیب کے پاس ضرور ہے لیکن ہمارے پاس نہیں۔ کہتے ہندوستانی
اپنی تہذیب کے بارے میں جانتے ہیں۔ کتنے افراد اپنی زبان خود پڑھو اور جان سکتے
ہیں اس ہندوستانی سے نفرت کرتا ہوں۔ جو ہندوستان کو گریزی زبان کے
ذریعے جانتا ہے۔

ہندوستان کے روحانی پیشواؤں کے بارے میں آپ کا بہا خیال ہے مثلاً
ہندوستانی اور توہمی کے شکرا جا رہی ہیں۔

اگر میں مذاکرہ اندھی کی جگہ پر ہوتا تو ان دونوں کو پھانسی پر پٹھا دینا حقیقت
نہ کاروباری ٹولہ ہیں ہندو سادھو قوت کے متلاشی ہیں۔ وہ بارہا ہوں لی ہندو
وجہوں کی طرح غلبہ پانے کی مانند وہ ذہنوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے

مہیوں کی نجی زندگی پر بھی غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جب کوئی مرید اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے اور سادہ مو سے صلاح لیتا ہے تو یہی سادہ مو اکثر اوقات بنے بنائے رشتے توڑ دیتے ہیں۔ صرف اپنی قوت کا اظہار کرنے کے لیے ان میں سے بہن جو تھائی تو اپنے مریدوں کی بیویوں پر بھی لغزت رکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں مرید اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ تم ہندو مذہب کی اخلاق سونری کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیا یہ اخلاق سونری جنسی عروہ کا نتیجہ نہیں ہے؟

جنسی پابندی ہندوستان کا نیا شاخسانہ ہے۔ پرانے اصول میں ہندوستانی معاشرہ اس پابندی سے آزاد تھا عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں نہیں نئی انداز وضع کرنا ہوں گی اعلیٰ ترین محبت کے پیچھے بھی لذت کا حصول پوشیدہ ہے۔ بائبل ایسے ہی جیسے بہترین دان میں زیادہ اٹھل ہوتی ہے سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم پرانے دور کی بات جارہے ہیں جب ہم دائیں پتے ہیں تو انھیں نہیں پی رہے ہوتے۔ لیکن حودی اکل کارسیا ہے وہ تیز ترین اٹھل ہی پنے کا سیکس بھی ایسے ہی ہے جس آدمی کو قدرتی طریقے پر جنسی آسودگی میسر نہ ہوگی وہ کسی گھٹیا سے گھٹیا طوائف کے پاس جائے گا خواہ وہ آئسکس کی مریض ہی کیوں نہ ہو۔

”نوجوان ادیبوں کو آپ کیا مشورہ دیں گے۔“

”جس موضوع پر آپ لکھنا چاہیں اسے تلاش کریں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ علم بہر حال محبت کا پھیلاؤ ہے پھر مکمل سنجیدگی اور خلوس سے لکھیں۔ ناؤی درجے کی تحریر ہرگز نہ لکھیں۔ اپنے تجربات کا اظہار کریں۔“

”اگر انگریزی زبان میں لکھیں تو اس سے کوئی فرق پڑے گا۔“

”یقیناً۔ اگر انگریزی زبان میں لکھنا مقصود ہو تو یہ گزیرا سوچیں کہ صرف ہندوستانیوں کے لیے لکھ رہے ہیں جتنی اچھی انگریزی ہوگی اتنی ہی بڑی مقبولیت ہوگی ایک اور چیز جب تک کوئی ہندوستانی اور اپنی غذا نہیں کھائے گا اچھی انگریزی نہیں لکھ سکے گا۔ ہندوستانی خوراک اعصاب کو متاثر کرتی ہے اور دماغ درست ہو جاتی ہے یہی

موضوع ہوں۔ لیکن نرادر چو بدری سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہے؟

”ہندوستانی طلباء کی بے چینی پر آپ کیا کہتے ہیں۔“

”ہندوستانی طالب علم بغاوت پر آمادہ ہے۔ وہ ہر اس قدر کا دشمن ہے۔ جو اس کی بزرگ نسل اس پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ ہر باپ کی خواہش ہے کہ اس کی اولاد مکمل طور پر وہ پرستار زندگی گزارے۔ بغاوت توڑتے ہیں لیکن ان کے پاس اپنی کوئی مثبت اقتدار نہیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں نااہلیت کی بنیاد پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی اور کسی بل کو نفع نہیں ملتا۔ اہل لوگ نااہل لوگوں کے لیے انشورنس پریمیم دیتے ہیں۔“

”وقت کم ہونے والے ہے نرادر چو بدری نے وہ وقت نکھٹنے کے لیے وقت دیا تھا لیکن عروق بہت قریب سے تھیں جتنے جتنے ہیں۔ نرادر چو بدری اچھی سب کچھ کہہ سکتا ہے وادکانے مجھے تھوڑا سا مسرت ہو دیا ہے۔ فرانسیسی پتھر کا زائنتہ ابھی تک تازہ ہے حالانکہ بہت دن سڑکی تحویل میں رہا ہے۔“

”دروازے پر وہ مجھے اپنے جاہانی سائل کے درخت اور پودے دکھاتا ہے ان میں پکٹش بھی ہے نہایت خوبصورت بہت سی عمدہ منی ایکچر وہ شفیق انداز میں پکٹش پر جھکتا ہے۔ میں دونوں کی طرف باری باری دیکھتا ہوں۔ دونوں میں بے انتہا مسرت ہے۔“

معجزہ ساز — داداجی

میرا کوئی مذہب نہیں مجھے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مذہب عقل سے انکار ہے اور عقل میرے لیے عظیم ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کے خلاف نہیں ہوں جو مذہب سے پیوستہ ہیں کیونکہ مذہب ان میں سے کچھ کے مفاد میں بھی ہے میں معجزوں اور جادو پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن یہ مانتا ہوں کہ کچھ نظریات ایسے ہیں جو سائنس دانوں کو بھی ششدر کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ امیر رائے چوہدری سے اپنی ملاقات کے ابتدائے طور پر لکھ رہا ہوں۔ امیر رائے چوہدری جسے اس کے ہی خواہ داداجی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مجھے داداجی کے بارے میں دو کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں مشہور و معروف ڈاکٹروں، پروفیسروں اور تاجروں کے خراج عقیدت تھے۔ یہ سب داداجی کے کرامات سے متاثر تھے اور بذات خود تجربہ کر چکے تھے۔ میرا تجسس بیدار ہوا کچھ روز بعد فلم سارا بھی بھٹ جا رہا میرے ذہن آیا اور مجھے داداجی سے ملانے سے گیا اس کے چہرے پر تھوٹتی خوشی کی لہروں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ غالباً اس نے مجھے داداجی کے دھرم باسیوں، پیدوں میں شمار کر لیا تھا۔ میں واقعات کے انہار میں کسی تعصب کو بردہ نہ کار نہیں لاتا۔ ہندو میں داداجی کے کمرہ استقبال میں دیوان کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا اور وہ دیوان بھی غالباً داداجی کے لیے تھا۔ اس وقت۔ ہاں تقریباً آدمی درجن مرد اور عورت تھے سب کے سب بنگالی۔ داداجی اندر داخل ہونے سب تعظیماً کھڑے ہو گئے ایک آدمی نے نو بڑھ کر اپنا سر داداجی کے پاؤں پر رکھ دیا۔

داداجی لمبے قد اور نازک جلد کے مالک ہیں۔ ان کے کالے گیسو دراز ہیں ان کی جوانوں والی خوبصورتی ان کی ستر سال کی عمر کو جھٹکا دیتی ہے جو کوئی بھی ان کو دیکھتا ہے ان کی پیناٹرم کے اثر والی آنکھوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے پرمگانہ ہا (نوش کی خوشبو) سارے کمرے کو معطر کر دیتی ہے۔

داداجی دیوان پر بیٹھ جاتے ہیں اور میری طرف متوجہ ہوئے ہیں میں اٹھتا ہوں اور ان کے قدموں کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ مجھے بڑے ہر بان لیکن مسخر کرنے کے انداز میں گھورتے ہیں۔ وہ جانتا چاہتے ہیں کہ میرے آئے کا مقصد کیا ہے میں بتاتا ہوں کہ میں کسی مذہب کا ماننے والا نہیں کسی روحانی شے کا جبر و تسلیم نہیں کرتا اور داداجی اور ان کے پیروکاروں کا تجسس مجھے دہان کھنچ لایا ہے۔

”اگر سری سیتہ نا انن خود تم سے بات کرنا چاہیں تو۔“ وہ پوچھتے ہیں۔ میں کچھ کچھ نہیں پاتا۔ اگر وہ تمہیں کوئی نشانی بھیجیں تو۔“ وہ پھر پوچھتے ہیں وہ اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہیں جو خالی ہے لیکن میرے سامنے ہی اس پر ایک کانسی کا تمغہ نمودار ہوتا ہے جس پر ایک بزرگ کی شبیہ ہے۔ یہ سری سیتہ نارائن کی طرف سے تمہارے لیے تمغہ ہے۔“ داداجی کہتے ہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں احتجاج کرتا ہوں داداجی۔ یہ آپ مجھے دے رہے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہیں میں کچھ بھی نہیں۔ یہ تمام کرامات سری سیتہ نارائن کی ہیں۔“

تمہارا نام کیا ہے وہ پوچھتے ہیں میں بتاتا ہوں وہ تمغہ واپس لیتے ہیں انو تھے اس کی ایک طرف مسلتے ہیں جو حرف خان تھی اب اس پر ایک نام لکھا ہے صرف میرے نام کے ہیج درست ہیں صرف ایسے لمحے کے بعد داداجی کی تھیلی پر ایک سونے کی نہجر نظر آتی ہے۔ اب یہ تمغہ تمہارے گلے میں پہنانے کے لیے ہے وہ کہتے ہیں۔ اور مجھے تھماتے ہیں۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ مجھے اپنی خوابگاہ میں لے جاتے ہیں ایک دفعہ پھر ہم مختلف سطحوں پر ہیں وہ اپنے بستر پر بیٹھ جلتے ہیں اور میں فرش پر رہے مجھے

بتاتے ہیں کہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہیں سرری سیتہ نارائی تمام کائنات پر چھائے
 ہیں۔ مگر کوئی نہیں ہیں ہر آدمی اپنا گردا پ ہے کیونکہ وہ سرری سیتہ نارائی کا حصہ
 ہے۔ یاد رکھنے کا حصہ ایک طریقہ ہے۔ کہا نام سادہ یہ کسی بھی زبان میں ہو سکتا ہے
 تم اسے اپنی زبان میں معلوم کرنا چاہتے ہو۔ "وہ مجھے کاغذ کا ایک خال پر نہ پکڑاتے
 ہیں اور سرری سیتہ نارائی ان تصویر کے سامنے جھکنے سے یہ ہتھیلی میں ایسا ہی
 کرتا ہوں۔ کاغذ پر گور مکھی میں دو الفاظ ابھرتے ہیں گو پال گو بند۔ ایک لمحے کے
 بعد کاغذ پھر سفید ہے۔ ظاہر اظہار پر پیغام مل چکا ہے اور کاغذ پر تحریر کی ضرورت
 باقی نہیں۔ وہ میری دائرہ ہی پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس میں سے پر ماگندہ کی خوشبو
 آنے لگتی ہے۔ ایک دہرے کے لیے یہ ایک سو دہندہ تجربہ ہے لیکن اس سے میرے
 مذہب کو نہ ماننے اور معجزوں پر عدم یقین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ ہی میری عقل
 خدا کے بارے میں اس قسم کی شیعہ بازیوں کو تسلیم کرتی ہے۔ مگر اور جہان نام
 (اسم اعظم) ہماری دھرتی کے فلسفے میں شامل ہے۔ لیکن میں قلمی کو اس کے
 ذہن کی رسائی پر چھوڑتا ہوں۔

موم بتی کی روشنی اور داتا گیل

اچانک بجلی فیل ہو جاتی ہے میں اپنے بھائیوں کے ہاں پتہ کرتا ہوں۔ ان کی بجلی باگل
 ٹھیک ہے میں واپس آکر مختلف سوچ ان آف کرتا ہوں شاید کوئی خرابی نظر آئے۔
 کلا کلاک، کلاک کلاک۔ بجلی ندرد۔

شاید فیوز آؤٹ ہوا ہے۔ میں ہمیشہ سوچ بکسوں سے خوفزدہ رہا ہوں اور سرکٹ شارٹ
 ہونے کا ڈر تھا۔ فیوز نکلنے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا میں صرف فون کر کے مدد کے
 لئے پکار سکتا ہوں۔ لیکن اس طرح نو گھنٹوں صرف ہو جائیں گے میں ایک جھوٹی سی دہ
 دہاتا ہوں بجلی کی روشنی کا دیوتا میری اس دعا کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ میں موم بتیوں کا
 وہ پیکٹ نکالتا ہوں جو ہندو پاک جنگ کے دوران خرید تھا۔ انہیں ایک خاص طریقے
 سے لگاتا ہوں اور جلاتا ہوں

فانی بیل طاموش ہے اس لیے دروازے پر دستک ہوتی ہے شاید زیرو کا مان
 گئے ہیں اور انہوں نے کسی کو مدد کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔
 واہ۔ حقیقتاً یہ ایک دیوتا سماں انسان ہے۔ کالے بالوں اور کالی دائرہ میں سے
 داتا گیل کا زرد چہرہ پورے چاند کی طرح نمودار ہوتا ہے اس کا سیکرٹری اور ہر دست
 اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوتا ہے۔

میں اس کی تاریکی اور بجلی فیل ہونے کی وجہ سے کمرے کے اندر کی گھٹن پر معافی
 مانگتا ہوں۔ مگر کی کوئی بات نہیں ہے وہ میرے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہتا ہے حقیقتاً
 یہ بسبب روشنی کی بجائے موم بتی کی روشنی زیادہ پسند کرتا ہوں۔ سہ سے دس
 یہ بسبب خیال آتا ہے کہ بجلی کا فیل ہونا داتا گیل کی منی سے آتا ہے۔ یہ

وہ کتبیں سال کا جوان آدمی ہے ردی مائل حلد۔ لیکن گفتگو کا انداز اور اس کی آنکھوں کی قوت طبع برکرتی ہے۔ اس کے اندر کتنی توانائی موجود ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ میڈن جج کا بیٹا ہے اور لیڈز یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے وہ صوفیہ پر بیٹھ جاتا ہے اپنا کمرہ تنہا کرتا ہے اور کہتا ہے: "تم مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔"

ہاں پوچھنا تو بہت کچھ ہے بس مجھے ڈر ہے کہ میں کئی بار کی سنی ہوئی باتیں ہی سن سکوں گا۔ بہتر ہے کہ آج بات جیت تھارے مارے میں ہو۔ تم اس راستے پر یعنی روحانیت کے راستے پر کچھ آئے۔؟

روحانیت۔ میرا چوائیزم۔ مجھے اس کا پسند آتا ہے۔ میں سال کی عمر میں ہوا میں نے اندر وسعت کی ایک عجیب حس بیدار ہوتے ہوئے دیکھی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو۔؟

اوپر ہوں۔ وسعت سے کیا مراد۔؟

وسعت سے مراد پھیلنا ہے۔ بڑا ہونے کا احساس۔ "وہ وسعت کرتا ہے۔ اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلاتا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح سینہ بڑا کرنے کے لیے لوگ ورزش کرتے ہیں۔ کیا اب بات سمجھ پائے ہو۔؟"

ہاں۔ تاہم تم بتاؤ جو کیا۔ تم نے کیا محسوس کیا۔؟

میں نے دریافت کیا کہ میرے اندر واقعات کو پہلے سے دیکھ لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ کیا سمجھتے ہو۔؟

ہاں نے اقرار میں سر ہلایا۔ کیا سمجھتے یا سمجھتے ہو اس کا تکیہ کلام ہے اور

گو سیر دوران وہ ان کا بے شغلا استعمال کرتا ہے۔

مجھے کوئی مثال دو۔ میں مطالبہ کرتا ہوں۔

ہر نو سنو۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میں نے ایک رات خواب میں ایک صاحب رہنما جو بونل میں رہتا تھا مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے رہائی پانے کی درخواست کر رہا ہو۔ اگلے روز جب میں کالج کی لیب رٹری میں گیا تو میں نے وہیں

ایک چار میں صاحب موجود تھا جو کوئی شخص خبر بات کے لیے سانس کے اتارنے کے لیے آیا تھا میں نے اس شخص سے اس صاحب کو آزاد کرنے کے لیے کہا۔ وہ ایسا کرتے ہوئے بہت جھنجک رہا تھا مراٹھی میں ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ زخمی صاحب زوند چھوڑ کر آپ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جس نے اس شخص کو ٹھہر کیا اور اس نے صاحب کو آزاد کر دیا۔ اب تم بتاؤ تمہارا اس واقعہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ہو سکتا ہے اتفاقاً ایسا ہوا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے واقعہ ہوا اور بعد میں خواب آیا جو سب کچھ ہو۔ میں نے کہا دانا بل میرے اس نظریے پر ناخوش نظر آتا ہے۔ پیش بینی سائنس طریقے سے ثابت کی جا سکتی ہے مگر حال میں سب ایک باری میں کا نام ہے۔ اگر تم ماضی کے بارے میں سوچ رہے ہو تو میرے مستقبل کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہو۔ وہ اس شائن کے الفاظ دوہرا رہے وہ

تو رد و شیع اور اس میں سکاکی کے نظریات کا حوالہ دیتا ہے۔ کہا مجھے۔؟

نہیں میں اس طریقے سے ماضی کو جمع نہیں مانتا۔ سائنسی توضیحات صوفیانہ بات پر نہیں محسوس جاسکتیں۔ بالکل اس شائن سے پھل نکالنا اس میں سکاکی پر پتہ چنا مناسب نہیں۔

تو رد و شیع آپ سکاکی کی نسبت زیادہ قریب قیاس سے لیکن پیش بینی کی ممکنات تو نو ستر ازم کی پیش گوئیوں سے بھی ثابت ہوتی ہیں۔

"اور ہمارا اپنا بھگوسامست بھی تو۔ دانا بل کا سیکرٹری ڈیپٹی مداخلت کرتا ہے" میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ یہ نو ستر ازم یہ بھگوسامست سب سوالیہ ہیں۔

اور اگر اسے ہی تم سائنس طریقہ کہتے ہو تو پھر یہ ہے یہ صوبہ کے "والوں"۔ نہیں۔؟

میں کہتے ہوں۔

دانا بل موضوع تبدیل کر دیتا ہے۔ کیا تم شیلی کوئی نے اس پر باتیں رکھنے پر۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہیں کہ میں اس افکار کا مددگار نہیں ہوں یا نہیں۔ پھر وہ میری مدد کرتا ہے۔ میں چیزوں کو اپنی قوت مادی سے اب تک

دوسری جگہ حرکت دے سکتا ہوں۔

میں نے ان کے ماہر بھی لوگوں کی حرکت پر قابو پاتے رہتے ہیں۔ میں جواب دیتا ہوں
ہر انسانوں پر نہیں۔ میں سبے جان چیزوں کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تم کو بالور
آؤ تو میں اس کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ داتا بل کتاب ہے۔

تو بالور کیوں۔ یہاں کیوں نہیں۔ میں اعتراض کرتا ہوں داتا بل وضاحت
کرنا کہ ایسے واقعات کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ اپنی اور
کلمات کا اظہار کرنے کے لیے تیار ہے وہ مکمل تہیں منٹ کے لیے اپنی سانس روک
سکتا ہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے میں بڑا لطف ہے۔ وہ بہت بڑا لکھا ہے۔ اور
اسے دیکھ کر مجھے کوئی دل کا آؤٹ سا ڈر یا ڈا جانا ہے۔ سانس، روحانیت اور فلسفے کا علم
میں سادھو، سوامی یا سٹیسی ہرگز نہیں ہوں۔ وہ کہتا ہے۔ میرے لیے ایسا
بنا مشکل نہیں۔ ایک وقت میں لاکھوں افراد میری بات سننے کے لیے بے قرار
ہوئے ہیں۔ میں ان کو دیر تا نہیں بنا چاہتا۔ میری شناخت اگر روحانیت کے علم
کی حیثیت سے ہو تو یہی بہت ہے۔ میں محبت کی قوت کا سبق دیتا ہوں۔ میں خورد و نوش
کے اصول وضع نہیں کرتا۔

میں تم تجربے کے ذیل ہوا اور جنس تعلقات سے کسی دست بردار ہونے پر یقین رکھتے ہو
میں ایسا ہے میں اس کی وضاحت میں ہر کسی موقع پر کر دوں گا۔

یہ حال ہے کہ داتا بل سے میری گفتگو اب کسی روز زیادہ طویل پکڑے گی اور
جیسا کہ ان حوالہ مآلاتوں میں ہوتا ہے، ایک موضوع سے کسی اور موضوعات جنم لیتے
ہیں۔ سیکس کے تجربہ کی طرف۔

مرارجی ڈیسانی

میں وقت مرارجی ڈیسانی کی طرح کیا ہی برس سے شکستہ تھا ہوا اور کسی قدر منتشر
ذہن کا ماہر۔ یہیں کچھ دنوں سے وہ مسلسل گفتگو اور سفر میں مصروف ہے میں اس سے
بسی ایئر پورٹ پر مل سکا جب وہ کھوج سے واپس آیا تھا۔ جو بھی اس کی نظر پر پڑی
وہ یہی حیرت پیدا کیا۔ وہ میرے بخت روزہ پرچے کے بارے میں فکر مند تھا اور مجھے
گھر کی کچھ باتیں بتانا چاہتا تھا شاید اس نے محسوس کیا کہ مجھے گاندھی بوجھارت کا اس
سال کا مرد آہن لکھ کر میں نے اپنے پڑھنے والوں کو مایوس کیا ہے۔ میں نے احتجاج
کیا اور وعدہ کیا کہ اسے تمام خطوط دکھاؤں گا میرا خیال نہیں کہ وہ مجھے انٹرویو کے لیے
وقت دے۔ لیکن اس نے کہا سارے پانچ بجے آ جاؤ لیکن میرے انٹرویو میں بعد میں
کوئی کمی پیشی نہیں ہونا چاہیے۔

مرارجی بھائی کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں لیکن میں اس کی وطن
دوستی کا ہر حال میں قائل ہوں وہ آپ کو جھاڑ تو پلا سکتا ہے جیسا کہ اس نے مجھے
پہنائی لیکن اس کی نیت کبھی بڑی نہیں ہوتی اور اندر گاندھی ہی کی مانند وہ
وقت طلبے پناہ پابند ہے ٹھیک سارے پانچ بجے دوسرے مذاقیوں کو باہر نکال
دیا گیا اور مجھے اندر بلا گیا اس وقت وہ اپنی عمر سے بیس سال بیٹا لگا رہا تھا
گرم جوش اور دوسرا۔ میں نے گفتگو اتنی ترافت پر مبنی ہوئی اور وہ کبھی غارت
کو ضائع نہ کرنا۔

میں نے ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کی شب جبہ آبی کی گرفتاری عمل میں لائی تو آپ نے
کہ محسوس کیا۔

ج: یہ میرے لئے اچانک نہیں تھا۔ کم از کم دو سال سے اور زیادہ تر ۱۹۷۷ء سے مجھے اس کا احساس تھا کہ کوئی ایسا قدم اٹھنے والا ہے اسی لیے میں نے دودھ بھوک ہڑتال کی تاکہ لوگوں کو بیدار کیا جاسکے۔ یہ قربانی ہی ہے جو لوگوں کو بیدار کرتی ہے۔
س: ایمر جنسی کے دوران کتنے لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔

ج: کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق ڈیڑھ لاکھ کچھ کے خیال میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار لیکن ایک لاکھ سے کم کسی صورت میں بھی نہیں۔

س: سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد صرف بارہ ہزار ہے۔

ج: یہ سفید چھوٹ ہے۔ صرف اٹھارہ ہزار افراد تو مدھیہ پردیش کی حکومت نے گرفتار کیے اور یہ بات ان کے گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔

س: گرفتاری کے دوران آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔

ج: میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا گیا۔ نہ ہی وہ بُرا سلوک کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

س: ریڈیو اور اخبار سے دور تو رکھا جاسکتا تھا۔

ج: پہلے دو تین روز تو ہمیں کوئی اخبار مہیا نہیں کیا گیا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ اخبار یا ریڈیو میرے نزدیک خوراک سے زیادہ اہم ہیں اور اگر آئندہ دور دراز میں یہ چیزیں مہیا نہ کی گئیں تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔ دنیا میں بائبل میں کیا ہو رہا ہے اس کی خبر کے بغیر زندگی کیسے ممکن ہے میں نے تحریری درخواست نہیں دی تھی بلکہ ایک آفیسر کو زبانی بتا دیا تھا اور پھر اگلے ہی روز مجھے اخبار مل گئے۔

س: انیس ماہ کی قید کے بعد آپ میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ کیوں؟

ج: میں بھگوان پر یقین رکھتا ہوں اس لیے میرے اندر تلخی پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں بھگوان اور اس کے اصولوں پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قانون فطرت کے برعکس کچھ ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ حق اگر میری گرفتاری بھی یہاں تک کہ وزیراعظم کا عہد بھی قانون فطرت کے خلاف برقرار نہیں رہ سکتا لیکن یہ تمام بات

اس تربیت سے ہوتے ہیں کہ نتیجتاً بہتر صورت سامنے آجاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ناتینا نڈ جیسی موزی بیماری آپ کی صحت بہتر بنا دیتی ہے کیونکہ آپ اس کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ اگر جدوجہد نہ کریں تو پھر صحت یقینی ہے۔

اگر میری قید تانڈن فطرت کے خلاف ہوتی تو مسز گاندھی کا ندھی مجھے جیل نہیں بھیج سکتی تھیں اگر آپ میں ایمان ہے تو آپ ہر چیز کا مقابلہ آسانی سے کر سکتے ہیں کیا آپ یقین کریں گے کہ قید کے دوران میں بالکل صحیح و سالم رہا حالانکہ میں قید تنہائی میں تھا۔ اور سب کم لوگ قید تنہائی برداشت کر سکتے ہیں ایک شخص اکیلا رہ کر پاگل ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھا۔ خدا ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔

س: کیا آپ اتنے اہم لیڈر تھے کہ آپ کو سب سے آخر میں رہا کیا گیا۔

ج: یقیناً میں آخری آدمی تھا جو رہا ہوا۔ اس لئے کہ میں نے کبھی موجودہ پابندیوں کے سامنے سر خم نہیں کیا۔ اگر میں جیل سے نکل آتا اور الیکشن انوائس نہ ہوتے اور ایمر جنسی لگی رہتی تو میں خاموش نہ بیٹھتا۔ میں اس کے خلاف بیان دیتا اور پھر جیل میں ہوتا۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا۔ اگر میں اکیلا ہی احتجاج کرنے والا ہوتا تو بھی میں ضرور کرتا۔ اسی لئے انہوں نے مجھے اس وقت رہا کیا جب انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا لیکن یہ میرا اپنا اندازہ ہے اور یہی درست وجہ بھی ہے۔

س: آپ کے خیال میں مسز گاندھی کی طرف سے انتخابات کا اس موقع پر اعلان کرنا کیا معنی رکھتا ہے یہ انتخابات ایک سال پہلے یا بعد میں بھی ہو سکتے تھے۔

ج: مجھے معلوم نہیں میرا خیال ہے کہ مسز گاندھی کو یہ محسوس ہو گا ہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بے چینی ان کی اپنی پارٹی کے اندر اختلافات، مایوسی اور بے چینی دن بدن ان کے انتخاب جیتنے کے مواقع کم کر رہی ہے۔

ج: جی خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام سے بہت سے لوگ نالاں ہیں یتیم خانوں کے بارے میں جانتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اب وہ اسے رضاکارانہ طور پر کر دانے کے

احکامات دے چکی ہیں اور اس سلسلے میں طاقت کا استعمال ختم کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت جبر کیا گیا تھا دہلی اور مظفر نگر میں کئی افراد کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا لیکن اس کا ذکر بھی اخبار میں نہیں کیا۔

میں اس سے اس بے واقف تھا کہ میری قید کے دوران بھی ایسا ہوا۔ لوگ بسوں سے باہر گھیسے گھیسے اور ان کی نس بندی کر دی گئی۔ اس کے بعد کئی دنوں تک بسیں خالی درڑا گئیں۔ لوگ خوفزدہ تھے اور ان میں سفر نہیں کرتے تھے۔ اسی احتجاج اور غم و غصے کو دیکھتے ہوئے مسز گاندھی نے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کے بعد وہ منتخب ہونے کے سلسلے میں قطعی طور پر ناامید تھیں اگرچہ وہ یہی کہتی رہیں کہ وہ جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں اس لیے انتخابات کروا رہی ہیں۔

مے: آپ کے خیال میں انتخاب سے پہلے زیادہ اہم مسائل کیا ہیں

ج: ہم نے انہیں اپنے منشور میں تفصیل سے لکھا ہے۔

م: آپ نے لکھا ہے جمہوریت جتنا بلڈ ڈکٹر مشاب

ج: نہیں میرا کہنا ہے جمہوریت مفاد جمہوریت کا نقصان کیونکہ کسی نہ کسی مجبور

تقریب شکل میں جمہوریت تو ضرور موجود ہے۔ اصل میں اسے انسان بہت پہنچا ہے اور زیادہ نقصان چوری نس بندی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب کسی وقت بھی ڈکٹیٹر مشاب کی توقع ہو سکتی ہے۔ آئین میں ایمر جنسی کی ترامیم کا اعلان کر دیا گیا ہے اور ایمر جنسی لگانے کے بغیر بھی جبر مسد کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔

دور از اسد خوف کا ہے میں خوف کے تدارک کے لیے کام کرنا چاہیے

اس خوف نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے مجھ پر جبکہ خوف نظر آیا ہے۔ ۱۸ جنوری کے بعد حالت ذرا بہتر نظر آتی ہے۔ اگرچہ ایمر جنسی اٹھائی نہیں گئی لیکن اسے نرم کیا گیا ہے اور وزیراعظم سے آزادانہ انتہا بات کے انعقاد کا اعلان کر دیا ہے ہر کوئی لوگوں پر این نقطہ نظر واضح کرے گا اس لیے اب تو کسی حد تک دہشت سے باہر آچکے ہیں۔

اسی طرح پریس کی پابندیاں بھی نرم ہوئی ہیں۔ انتخابات کے اعلان کے بعد

سٹیشن اور انڈین ایکسپریس نے ہمیں کافی گورننگ دی ہے۔ یہ اخبار ایمر جنسی کے دوران بھی خود مختار تھے، لیکن ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا کی سرکوشن خاصی متاثر ہوئی ہے اب یہ اخبار بھی حزب اختلاف کے نظریات کو جھوٹے دینے لگے ہیں۔ اس سے بھی ہمارا معاملہ کچھ بلند ہوا ہے لیکن یہ تمام مسائل نہیں ہیں۔

آئین کی بجالی کے لیے بہت سی بنیادی باتیں اہم ہیں۔ ہمیں اس بات کی ضمانت دینا ہوگی کہ اس قسم کی ایمر جنسی دوبارہ نہیں مسد کی جائے گی کوئی حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ پھر ہم حکومت کے ترقیاتی منصوبوں پر غور کریں گے کیا وہ گاندھی کے نظریات کے مطابق ہیں؟ یعنی گاؤں خوش حال ہیں۔ اور اگر گاؤں خوش حال ہیں تو شہر اپنے آپ خوش حال ہوں گے۔ آج شہروں میں نقصان ہے۔ اور گاؤں ٹوٹ رہے ہیں یہاں تو میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔

ہم مغرب کی طرح صنعت کی ترقی نہیں چاہتے۔ بہت سی چیزیں مشترک ہو سکتی ہیں بڑی صنعتیں ضرور ہونی چاہئیں لیکن جہاں ان کی گنجائش نہیں وہاں چھوٹی صنعتیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ دیہات کے لوگ پوری طرح روزگار حاصل کر سکیں ہم نے اپنے منشور میں اس سارے کام کے دو سال کا عرصہ رکھا ہے۔

ایک اور بڑا مسئلہ بدعنوانی کا ہے۔ اس کے بارے میں کمیشن تشکیل دیئے جائیں گے۔ اب دیکھیں کہ لوگ پال بل گذشتہ چھ سال سے استوار ہیں پڑا ہے اگر ہم اقتدار میں آگئے تو سب سے پہلے اس بل کو منظور کروائیں گے اس بل کی دفعات سے وزیراعظم اور وزیراعظم بھی مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ اگر کوئی شکایت موصول ہوئی تو اس کے احتساب سے کوئی بھی مبرا نہیں ہوگا صرف اور صرف اسی طریقے سے بدعنوانی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

مے: یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس بات کا اعتماد ہے کہ انتخابات آزاد اور منعقد ہوں گے۔ اس اعتماد کا پس منظر؟

ج: میں مطمئن ہوں کیونکہ سابقہ تجربہ بتانا ہے کہ ہم ایسی صورت حال سے نکلنے کے

قابل ہیں اور میرے خیال میں ہمیں وزیر اعظم کے بیانات پر براہمادی نہیں کرنی چاہیے مگر گاندھی نے کہا ہے کہ انتخابی بات آزادانہ اور متصفانہ ہوں گے تو ہم اس وقت تک یقین کریں گے جب تک کہ اس کے برعکس ثابت نہ ہو۔

س: کیا آپ سماچار دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کے کردار سے مطمئن ہیں؟
ج: جیسے تو ایسا نہیں تھا لیکن اب انہوں نے حزب اختلاف کو کوڑے بج دیتی شروع کی ہے لیکن پھر بھی وہ حکومت کی خبریں زیادہ نشر کرتے ہیں۔ وہ جانت داریں اور جہاں تک سماچار کا تعلق ہے تو وہ تو ایک آزاد خیور ایجنسی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے درمیان صاف متعادل ہے اور خود مختار ہیں۔ ائی لے ایس کا ایک فرد سماچار کا بھنگ ڈزیکر مقرر کیا گیا ہے ان حالات میں سماچار کو آزاد ایجنسی کیسے کہا جاسکتا ہے اسی بات پر ذہن مقرر ہوتا ہے۔ اس سے حکومت یا حکمران پارٹی کی نیک نیتی کمزور ثابت ہوتی ہے۔
س: کہنی کے عطیات پر پابندی کے بارے میں آپ کا رد عمل کیا ہے؟

ج: اس سے عطیات نہ دینے کے بل پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اگر آپ سوچیں گے تو ہمیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

س: لیکن بہت سی کمپنیوں کو آپ سے ہمدردی ہے۔

ج: وہ تو بے یقین اگر وہ ہمیں کوئی عطیہ دیں گی بھی تو وہ خود تباہ ہو جائیں گی اب بھی بہت سے کانگریس کے ممبر پولیس، انسران اعلیٰ ایم پی اے یا ایم این اے کے علاوہ لوگوں کو دھمکا رہے ہیں کہ ۲۲ مارچ کے بعد وہ ان سے نمٹ لیں گے میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں دہلی میں ایک پرنٹنگ پریس ہے اس کے مالکان ہمارے ہمدردوں میں تھے ان میں سے ایک نے مجھے فون پر بتایا کہ انہیں اپوزیشن کی مدد کرنے سے روک دیا گیا ہے انہیں بتایا گیا کہ MISA ابھی بتائی نہیں گئی۔ ایمر جنسی ابھی برقرار ہے اور تمہارے ساتھ بعد میں نمٹا جائے گا۔ مالکوں نے پوچھا کہ وہ اب کیا کریں تو میں نے کہا کہ اگر وہ خوف زدہ ہیں تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی نصیحت کر سکتا تھا کہ اگر وہ ہماری مدد کرنے سے خوف زدہ ہیں تو پھر کسی کی بھی

مدد کریں لیکن اگر ہم تمہیں کوئی چیز شائع کرنے کے لیے دیں تو وہ ضرور شائع کر دے اور ایسا بھی نہ کر سکتا اللہ حافظ۔

انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا ہے اور اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں لوگوں کو ڈرانا نہیں چاہتا بلکہ میں ان کے اندر موجود خوف ختم کرنا چاہتا ہوں۔

س: بابو جگ جیون رام کے استغفی کا کیا رد عمل تھا۔ انہوں نے پہلے ہی استغفی کیوں نہ دیا؟

ج: جگ جیون رام نے پہلے ہی مستغفی نہ ہونے کی وجہ بتائی تھی اگر وہ پہلے ہی ایسا کر لیتا تو حیل میں ہوتا اور انتخابات نہ ہوتے۔
س: کیا آپ اس وضاحت سے مطمئن ہیں۔

ج: مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں نے اسے تنکے کو نہیں کہا تھا لیکن اس کا کانگریس چھوڑ دینے کا فیصلہ پہلے ہی سے معلوم تھا۔

س: چون صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج: مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

س: آپ کا کیا خیال ہے وہ کانگریس چھوڑے گا۔

ج: میرا خیال ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔

س: جگ جیون کا کابینہ اور کانگریس چھوڑنے کا کیا اثر مرتب ہوگا؟

ج: جگ جیون بابو کا کانگریس چھوڑنے کا فیصلہ ہر سختیوں اور سبکی جات

کے دوسرے لوگوں پر برا اثر ہوگا۔ کیونکہ اس ملک میں قربانی یا تپاگ کی بڑی قدر ہے اور ایسا عمل اپنا اثر ضرور چھوڑتا ہے۔

س: کانگریس جمہوریت کی خاطر جتنا پارٹی میں کیوں شامل نہیں ہوتی۔

ج: نظریاتی اختلافات تو کوئی نہیں ہیں وہ بھی گاندھی جی کے نظریات کے مطابق

ہیں لیکن دوسرے اختلافات بھی ایسے نہیں کہ ہم دھڑے بٹھ جائیں یا دیں اختلافات تو

مرکز نہیں طریقہ کار کے بارے میں ایک نظریات ہیں جن پر غور کیا جاسکتا ہے

س: مسز گاندھی کا خیال ہے کہ جتنا پارٹی، پارٹیوں کی جوں جوں کامربہ اور ان میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ نہ ہی ان کا کوئی پروگرام ہے۔

ج: وزیراعظم ایسا کہہ سکتی ہیں۔ آپ نے ہمارا منشور دیکھا ہے۔ آخر لوگوں نے یونہی تو ہمارے پروگرام پر مباد نہیں کیا۔ ہم کیونزیم کے خلاف ہیں، ایک تقسیم کرنے کے خلاف ہیں اور عدم تشدد کے حامی ہیں اور گاندھی جی کے نظریات پر عمل پیرا ہیں۔
س: کمیونسٹوں سے آپ کی الرجی معلوم ہوتے ہوئے جیانی لی بات ہے۔

آپ کے ساتھ اتحاد میں شامل ہے۔

ج: تم کہتے ہو کہ مجھے کیونزیم سے الرجی ہے۔ مجھے کسی سے بھی کوئی الرجی نہیں۔ مسز خشتوت سگھ تم مجھ سے الرجک ہو سکتے ہو کیونکہ میں شراب نوشی نہیں کرتا، میں تم سے یادگیرینے والوں سے الرجک نہیں ہوں۔ میں تو صرف اتنا کہتا ہوں کہ جس طرح بیرونی نظریات معاشرے کے بے نقصان وہ ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی نقصان دہ ہیں اور نہیں ایسے کاموں سے روکنا چاہیے بصورت دیگر قوانین تعزیرات ہند بیکار ہو جائیں گی تاہم جتنا پارٹی کے اتحاد پر گفتگو کی طرف لوٹتے ہوئے میں یہ سوچتا ہوں کہ کوئی سرکشی مقابلہ نہیں۔ اس طرح تو منتخب ہونے والی حکومت اقلیت کی حکومت بنے گی اور یہ ہم نہیں چاہتے۔

س: DMK کے ساتھ آپ کا اتحاد بھی انہیں بنیادوں پر ہے۔ DMK تو اپنی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔

ج: نہیں وہ اس بات سے انکار کر چکے ہیں جب ہم انہوں نے واضح الفاظ میں یہ اعلان نہیں کیا تھا وزیراعظم ان کی ساتھی تھیں اب چونکہ انہوں نے عہدین کر دیا ہے اس لیے مجھے ان پر اعتماد ہے بصورت دیگر ہمارا ان سے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا اگر CPM بھی جمہوریت کی حمایت نہ کرتی تو ان سے ساتھ بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ لیکن یہ صرف انتخابی اتحاد ہے اور بس۔

س: اس کا مطلب ہے کہ یہ اتحاد صرف منتر گاندھی کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے ہے۔

ج: ہرگز نہیں۔ ہم برسر اقتدار پارٹی کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ اندرا کو نہیں ہمیں منتر گاندھی سے کوئی ذاتی پرغاشش نہیں لیکن جو نند وزیراعظم پارٹی کا کرنا دھڑا ہونا ہے اس لیے حزب اختلاف اسی کی بات کرتی ہے اور یہ سب پر مایاں ہے۔

س: اس کے پٹیل کے اس بیان پر آپ کیا کہیں گے جس میں اس نے کہا ہے کہ آپ کی جماعت میں اندرونی انتشار ہے اور اس کے ساتھ اور اس کی جماعت BPC کے ساتھ غلط رویہ رکھا گیا ہے۔

ج: کسی قسم کا کوئی انتشار نہیں۔ آراء کا اختلاف تو ایک فطری بات ہے۔ کیا ایسا اختلاف حکمران جماعت میں نہیں؟ امیدواروں کے چناؤ میں ایسا ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی حلقے میں دس موثر افراد ہیں تو آپ کس کس کا اطمینان کریں گے۔ بالآخر وہ کیٹی ہی فیصلہ کر سکتی ہے جو اس مقصد کے لیے تشکیل دی گئی ہے ہو سکتا ہے اس کے بعد لوگوں کے حقیقی اختلافات ہو جائیں۔ لیکن اگر کسی کے دل میں وطن کی حقیقی محبت ہے تو پھر اسے خود غرضی چھوڑنی چاہیے۔ اسے جماعت کی دکرنا چاہیے اور اسے کدور نہیں بنانا چاہیے۔

دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ ایس کے پائل نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کی اس نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا ہے۔ اور پارٹی کی مدد کی ہے۔ اس نے ہر ایک سے درخواست کی ہے کہ پارٹی کو مضبوط بنایا جائے تاکہ موجودہ حکومت کا خاتمہ کیا جاسکے مجھے اس کے اور کسی بیان کا علم نہیں۔

س: اس نے انتشار کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔

ج: اس کی اپنی پارٹی یا ذات کے خلاف انتشار ہو تو ہو اور تو کہیں انتشار نظر نہیں آتا ہم نے شامل جماعتوں کو سینٹوں کی اسٹیمٹ تو نہیں کی اس لیے یہ درست نہیں کہ BPC کوئی قرار داد پاس کرے وہ منتخب ہونے والے امیدواروں کا فیصلہ

نہیں کر سکتے۔ یہ بات تو کمیٹی پر منحصر ہے کہ وہ کسے مقرر کرتی ہے اور مسٹر ٹیل اس کمیٹی کا رکن تھا اب اگر وہ اس کمیٹی کو مطمئن نہیں کر سکا تو پھر بیان بازی کیا معنی رکھتی ہے کمیٹیوں پر بھر حال اعتماد کرنا فردی ہوتا ہے ہم ایک شخصی جماعت تو نہیں ہیں چیزیں کا یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کو باہر نکال دے اختلاف رائے کی صورت میں سنٹرل کمیٹی کا اختیار ادارہ ہے چیزیں نہیں۔ ہم ایسے فرد کی خواہش نہیں رکھتے جس کی آواز تنہا ہو بلکہ ہم اجتماعی آواز کے حامی ہیں۔ لیکن کسی ایک آدمی کا نقطہ نظر کمیٹی کے لیے یا سب کو اکٹھا رکھنے کے لیے سودمند بھی ہو سکتا ہے۔

ج۔ مختلف ریاستوں میں آپ کی جماعت کی کامیابی کے کیا مواقع ہیں

ج۔ ہر ریاست کے بارے میں جتنی طور پر کہنا تو مشکل ہے مگر ریاست میں نظریہ آنے والا جوش و جذبہ بڑا پیدا ہو رہا ہے۔ میں نے اسے ایک جذبہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ جدوجہد آزادی کی تحریک میں بھی نہیں۔ لوگوں کے بڑے بڑے مجھے محض شہادت دیکھنے کے لیے نہیں۔ لوگ بڑے منظم ہیں۔ اور بڑے دھیان سے اور غور سے بات سنتے ہیں۔ گاہ میں مکمل خاموشی سے ہماری گفتگو سنتے ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم غامض اکثریت سے کامیاب ہوں گے۔

ج۔ مسز گاندھی کا خیال ہے کہ آپ کی پارٹی کی حکومت مستحکم نہیں ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

ج۔ کیا یہ درست ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ہم واضح اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا وہ اکثریت حاصل کر لیں۔ میں ممکنات سے انکار نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر مسز گاندھی مستحکم حکومت بنا سکتی ہیں تو ہم بھی بنا سکتے ہیں اور کیا ان کی حکومت مستحکم ہے؟ ذرا دیکھتے کہ ان کی اپنی جماعت کے اندر کیا ہو رہا ہے لوگ پارٹی کیوں چھوڑ رہے ہیں اور صورت حال اتنی اطمینان بخش کیوں نہیں۔ ان کی پارٹی تو دوسری پارٹیوں کا محور نہیں۔ کیا کانگریس دوسری کسی بھی پارٹی سے زیادہ چوں چوں کا مرہم نہیں۔

ہم کوئی گئی گزری جماعت نہیں۔ اگر ہم میں کوئی اختلافات تھے بھی تو ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں ختم سمجھیں اور گاندھی جی کے راستے پر چلیں اور جو بنی انتخابات ہو جائیں گے ہم فردی اختلافات ختم کر کے ایک پارٹی بھی بن جائیں گے۔ ہم نے اس کا اعلان کر دیا ہے۔ اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کتنی جلدی ایسا کرنا ممکن ہے۔

ج۔ ہم انہیں اندر لے کر نہیں کہتے۔ یہ مرحوم کامراج کا بیان تھا جن کے ساتھ انہوں نے گٹھ جوڑ کر ناجا دیا تھا۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ حکمران جماعت کو بتائیں گے۔ یہ تو سربراہ کا بیان ہے کہ مسز گاندھی بھارت میں ہمیں الزام مت دیں یہ تو وہ خود یا ان کی جماعت ہے جو انہیں بھارت کی پہچان ثابت کر رہی ہے۔ ہمیں اندر گاندھی کی حیثیت سے ان کے ساتھ کوئی اختلاف ہیں ہاں وزیراعظم کی حیثیت سے ضرور ہے۔

ج۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ مسز گاندھی کانگریس لوکیونستوں سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ج۔ میں زیادہ تو نہیں جانتا لیکن کچھ ریاستوں میں اب بھی کیونست کانگریس کے ساتھ ہیں۔

ج۔ گویا جس طرح آپ کے اتحاد میں دوسری پارٹیاں ہیں۔

ج۔ اُن کا CPM یعنی کیونست پارٹی آف انڈیا کے ساتھ تو پکا معاہدہ ہے۔ صرف انتخابی رشتہ نہیں مثلاً وہ کیرلا میں کیا کر رہے ہیں کیا وہ مل کر انتخاب نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہم CPM کے ساتھ اس طرح انتخاب نہیں لڑ رہے۔ ہم صرف ان کے لیے سینیٹس چھوڑ رہے ہیں اور وہ ہمارے لیے۔ ہم ایک دوسرے کی خاد کام نہیں کر رہے ہیں جتنا پارٹی اکثریت حاصل کر کے حکومت بنالیتی ہے تو CPM اس کا حصہ نہیں ہوگی۔

من: کیا یہ درست ہے کہ بجے کا اندھ حکومت کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں اور کانگریس پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

ج: مجھے بتایا گیا تھا اور میں نے اخباروں میں بھی پڑھا ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے پولیس کا بڑا انتظام ہوتا ہے اس کے پاس بڑی بڑی کارپوریشنوں کی اجارہ داری ہے حتیٰ کہ جہاں تک خریدنے کے سلسلے میں وہ خود مختار ہے اور میرے خیال میں اس کا ذاتی طیارہ بھی ہے۔ اس سب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

من: قائد ملی کا حق ہے کہ وہ انتخاب میں کھڑا ہو۔ وزیر اعظم کا بیٹا ہونا اس کا یہ حق باطل نہیں کرتا لیکن کسی حکومتی مشینری استعمال کرنے کی اجازت نہیں خواہ وہ وزیر اعظم بن کیوں نہ ہو جب جنتا پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی تو پاکستان جرمی اور دیگر ملک کی طرح کسی سرکاری آدمی کو انتخابات کے لیے نہ گاڑی مشینری استعمال نہیں کرنے دے گی۔ من: لوگ کہتے ہیں کہ جب آپ بیٹی کے وزیر اعلیٰ تھے تو آپ بھی بڑے خود مختار تھے۔ کیا ایسا تھا۔

ج: کیا آپ کوئی ایسا واقعہ بیان کر سکتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے میں نے ناجائز فائدہ حاصل کیا ہو۔

من: میں یہاں نہیں تھا۔

ج: تو پھر دوسروں سے پوچھئے کہ کوئی ایک مثال ہی پیش کریں۔

من: یہ بھی ہیں پولیس کا نفرنس کے دوران آپ نے کہا تھا کہ آپ ٹائمز آف انڈیا کے خلاف ہو گئے تھے جب آپ وزیر اعلیٰ تھے کیا یہ پولیس کی آزادی کے خلاف بات نہیں اور کیا اس سے آپ کا خود مختار ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔

ج: میں نے اخبار کو اس کے نظریات کی بنا پر نہیں مڑا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کی تیر سو سال سے زیادہ ہے اور ہندوستان میں اس کی بے انتہا عزت و توقیر ہے میرا ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں حالانکہ وہ ہماری بجائے دوسروں کا ساتھ دیتے ہیں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پولیس مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیے اور حکومت اس

من: شرم کر رہے لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ حکومت زبردستی کی پشت پناہی نہ کرے اس وقت ٹائمز آف انڈیا زبردستی کی طرف مائل تھا اور کئی دوسرے پرچوں مثلاً

BLITZ کی مانند ذاتیات برقرار آیا تھا اس لیے میں نے انہیں ذاتی مجھے کرنے سے روکا تھا ان کے حوالے سے مجھے ۱۰۰۰ انٹرویوز کی شکایت کی لیکن پینڈت جی نے میری طرف داری کی اور کہا تم ایسا کیوں نہیں کہتے کہ اخبار کے نسخہ زیارہ ہیں اس لیے تم نے اشتہار بند کر دیا ہے۔ تو میں نے انہیں جواب دیا کہ میں ایسی جھوٹی بات نہیں کر سکتا جو من وہ ذاتیات کی پالیسی چھوڑ دیں گے میں انہیں سرکاری اشتہارات دینا شروع کر دوں گا۔ اور پھر اشتہارات ان کے مطالبے کے بغیر ہی انہیں دے دیے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کے کارکنوں میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے انہوں نے یہی مدد پاسی تو میں نے ان کی مدد کی۔ کیونکہ میں اس ادارے کے خلاف نہیں تھا اس کے بعد سٹریٹیکٹوریس میرے پاس آیا اس کا جنرل منیجر جے جی جی کے ساتھ مقدمہ چل رہا تھا میں دسٹوریس کے حق میں تھا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پولیس کے خلاف تھا میں گھری آدمی ہوں گا جیسا کہ وہں گا۔

من: آپ خاندانی منہ دہ بندی کے سلسلے میں راج گھریلوں کے خلاف ہیں اور راج کارنڈہ طریقوں کے حق میں ہیں۔ کیا یہ حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔

ج: یہ غلط ہے کہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ہوں میں تو اپنے آپ کو تابو میں رکھنے کے حق میں ہوں بالکل کا منہ دہی جی کی طرح لیکن ایسا کرنے والے لاکھوں میں دو تین ہی ہوں گے۔ اس لیے عوام الناس کی دوسرے طریقوں سے مدد کرنا چاہیے اور حکومت ایسا کر سکتی ہے لیکن یہ بالآخر نہیں مونا چاہیے آج کل لوگوں کی چیری نس بندی کی جا رہی ہے لوگوں کو دوسرے کھینچ کر نکال دیا جاتا ہے اور ان کی نس بندی کر دی جاتی ہے حتیٰ کہ بوڑھے لوگ بھی اس کا شکار رہے ہیں ایک ایسا شخص بھی اس فلم کا شکار ہوا جس کی شادی کر نہیں دیا تھا وہ چودہ برس کے تھے اسے بھی بس سے اتار لیا گیا اور اس کی نس بندی کر دی گئی۔

میں: یہ سب افواہیں ہیں کیا ان کی تصدیق ہوئی ہے۔

ج: میں آپ کو بتانا ہوں کہ یہ افواہیں نہیں ہیں۔ لوگوں کو قتل کیا گیا ہے میرے پاس مثالیں موجود ہیں میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں لیکن میں اس کا نام نہیں لے سکتا کیونکہ اس کی نوکری جانے کا خطرہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی بیوی ایک بچے کو جنم دینے والی ہے اس کے بعد وہ بیوی کی نس بندی کر دے گا لیکن اسے کہا گیا کہ اگر وہ خود ابھی نس بندی نہ کر دے گا تو اس کی تنخواہ بند کر دی جائے گی چھ ماہ تک اسے ایک پائی نہیں ملی بالآخر اسے نس بندی کروانا پڑی ایسی کئی مثالیں ہیں کہ پولیس نے لوگوں کو مارا پیٹا اور مجبور کیا۔ یہ کام ان طریقوں سے نہیں کیے جاتے۔ اب حکومت کو احساس ہوا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اب ہی انہوں نے مشورہ میں یہ کہا ہے کہ آئندہ کیا جائے گا میں مانتا ہوں کہ آبادی میں اضافے پر کنٹرول کرنا چاہیے لیکن یہ مقصد اس وقت زیادہ بہتر طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے جب لوگ خوشحال ہوں کہ آپ دیکھیں گے کہ غریب لوگوں کے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور امیروں کے ہاں کم۔ جو بھی لوگوں کے لیے اچھی ملازمت اچھا ماحول اور بہتر تعلیم مہیا کی جائے گی وہ خود بخود اس طرف مائل ہوں گے۔

س: کیا جنتا پارٹی کامیابی کے بعد آپ کو وزیر اعظم چن لے گی۔

ج: میں کچھ نہیں کہہ سکتا یہ تو منتخب شدہ ممبران پر منحصر ہے۔

س: لیکن آپ تو پارٹی میٹر ہیں۔

ج: میں پارٹی کا چیئرمین بھی ہو سکتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ممبران پر اپنا اثر دے سوخ ڈالوں گا۔ اگر مجھ سے کہا جائے تو یہ اگ بات ہے لیکن میں خود اس سے جوڑ توڑ نہیں کروں گا میں نے کبھی اس کی خواہش نہیں کی اور نہ ہی اب سے میں قندار کی خاطر جنت پارٹی میں نہیں آیا۔ میں نے نہ لگی بھر کبھی ممبران کی خواہش نہیں کی یہ خود بخود میرے پاس چلے آئے ہیں

س: بہر حال آئے کے بعد کیا آپ ایمر جنسی کے دوران ہونے والے واقعات

کی تحقیق کروائیں گے یا بعض لوگوں کے خلاف الزامات کی تصدیق کروائیں گے؟

ج: بہت نمایاں چیزوں کی تحقیق و تفتیش ضرور ہوگی مثلاً بدعنوانی۔

س: کس کی؟

ج: مثلاً یونین منسٹر مارچ میں ۱۲۵ ارکان پارلیمنٹ نے اس کے خلاف تحریری شکایت کی تھی لیکن یہ شکایت ایک طرف پھینک دی گئی اور ابھی تک اس پر کچھ نہیں ہوا DMK کو دیکھ لیں: مائل تارڈ کا پہلا گورنر DMK کی تعریف کرنے نہیں چھٹتا تھا۔ اچانک ہی وہ بدعنوان ہو گئے ہیں اور ان کے خلاف ایک کمشن تشکیل دیا گیا ہے لیکن یونین منسٹر کے خلاف کوئی کمیشن نہیں بنا یا گیا۔

اسی طرح جب تک کانگریس اکائیوں کے ساتھ غمی ہر چیز ٹھیک تھی۔ لیکن جوہنی انہوں نے ساتھ چھوڑا مرکز کی حکومت نے ان کے خلاف ایک کمیشن مقرر کر دیا لیکن انہوں نے ابھی تک یونین منسٹر کے خلاف کوئی کمیشن میں مقرر کیا کیا یہ درست اقدام ہے۔

وہ برس بہ برس حاکمیت میں تکرار کیے گئے تھے۔ اسی نے سیاست و دودھ کی بوتل کے ساتھ گھونٹ گھونٹ
پینا شروع کر دی ہوگی۔ میں نے اپنے سوال کی شکل تبدیل کی۔

سوال:- میرا مطلب ہے کہ آپ نے کب یہ محسوس کیا کہ ہمارے ملک کے سیاست دان کیسے ہیں
ان کے درمیان کیا اختلافات ہیں، اور وہ کیا چاہتے ہیں؟

جواب:- اس نے بغیر کسی تلخی کے جواب دیا۔ میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں۔ کافی عرصے سے
انہوں نے مادی کی بنا پر مجھے نشانہ بننا چاہا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح باقی باتیں بھی مجھے معلوم
ہو گئیں۔ اخبار اور لوگوں کی زبان۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ اگلوں سکا۔

سوال:- کیا آپ کو اپنے نانا یاد ہیں۔ کیونکہ جب ۱۹۴۳ میں وہ چل بسے تو آپ کی عمر چودہ پندرہ سال
کی تھی؟

جواب:- اُس نے میری طرح کرتے ہوئے کہا، نانا ۱۹۴۳ میں زہرے۔ بلکہ ۱۹۴۴ میں فوت ہوئے
تھے۔ اس وقت میری عمر سترہ سال تھی۔ مجھے وہ ابھی طرح یاد ہیں۔

سوال:- کیا آپ اُن سے بے تکلف تھے؟

جواب:- بالکل ایسے ہی جیسے دوسرے لوگ اپنے نانا یا دادا سے ہوتے ہیں۔

سوال:- کیا وہ آپ کی سوچ پر کسی طریقے سے اثر انداز ہوئے؟

جواب:- میں کوئی خاص طریقہ تو نہیں بتا سکتا۔

سوال:- اور آپ کی اپنے باپ سے بے تکلفی؟

جواب:- بالکل۔ ہر باپ اور بیٹے کی طرح۔

سوال:- کیا انہوں نے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزارا۔ تعلیم میں آپ کی مدد کی؟

جواب:- ہاں۔ اسباق کے دوران وہ میری مدد کرتے رہے۔

سوال:- میرا خیال ہے، یہی سلسلہ آپ کے بھائی اور والدہ کا بھی ہے؟

جواب:- یقیناً۔ جو رشتہ دوسرے لوگوں کا اپنے بھائیوں یا ماں سے ہوتا ہے، وہی میرا ہے۔

سنجے گاندھی

۶ شمار سوالوں سے مسلح میں اس سے ملنے گیا۔ یہ انٹرویو کوئی خاص کامیاب نہیں رہا۔

اُس نے کئی سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ راز گلے والی شخصیت ایک صحافی کے لئے بہت موزوں
ہوتی ہے۔ لیکن خاموش اور کم گفتگو شخص تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کی سوانح حیات لکھنے والا بھی
عذاب میں مبتلا ہو گا۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو انسان اپنے الفاظ میں وزن رکھتا ہے،
اس شخص سے زیادہ متاثر کرتا ہے، جو ہوا میں بات کرتا ہے۔

وہ درمیلے قد، صاف رنگت اور چمکے جسم کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں گہری،
تیز اور ایمان داری کا تاثر لے رہی ہیں۔ ایک کمزور سی سُکرا ہٹ ہمیشہ اس کے لبوں پر ہوتی ہے۔
معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ناراض ہے یا خوش۔ اسے بات پسند آتی ہے یا برعکس۔ وہ ہیضہ صاف
لفظوں میں گفتگو کرتا ہے۔ بشریلا پن لئے لیکن اپنے الفاظ کے استعمال میں بڑا محتاط۔ پیشانی
سے نیچے چلے ہوئے بالوں کے باوجود وہ ایک خوبصورت جوان ہے۔

سوال:- آپ نے سیاست میں دلچسپی لینا کب شروع کیا؟ میں نے پہلا سوال پوچھا۔

جواب:- صحیح طور پر تو یاد نہیں، کہ کب۔ لیکن میں جس ماحول میں پروان چڑھا، اس میں سیاست
میں حصہ نہ لینا ناممکن ہوتا۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کے دوران ہوا میں ہاتھ لہرائے۔ اُس
سے گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ اس کے باپ فیروز گاندھی، اس کے دادا جواہر لعل اور اس
کے پڑدادا موتی لعل کی ارواح نزدیک ہی موجود ہیں۔ ساتھ کے کمرے سے ایک نسوانی آواز بھی بھار
آجاتی تھی، اور میرا خیال ہے کہ یہ آواز اس کی ماں سزاندہ گاندھی کی آواز ہے۔ مجھے احساس ہوا،

میں اس کی خاندانی زندگی میں نقب لگانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے موضوع تبدیل کر دیا۔

سوال :- کیا مذہبی طور پر آپ کی تعلیم ٹوٹی۔ آپ مذہب کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب :- میں باقاعدہ طور پر مذہبی شخص نہیں ہوں۔ لیکن میں مذہب کے خلاف نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر کسی کو کوئی مذہب ماننے یا نہ ماننے کا اختیار حاصل ہے۔

سوال :- کیا کسی خاص کتاب نے آپ کو متاثر کیا؟

جواب :- میں کسی ایک کا قلم نہیں لے سکتا۔

سوال :- شاعری، ناول، تاریخ، سوانح۔ کس شعبے سے زیادہ آپ کو دلچسپی ہے؟

جواب :- کسی سے بھی نہیں۔ وہ مسکرایا۔ میرے مطالعے کے میدان اور ہیں۔

سوال :- ٹیکنیکل یا انجینئرنگ وغیرہ کی کتب؟

جواب :- ہاں۔ بالکل اسی طرح ہی۔

سوال :- آپ فیکٹری میں تنہا وقت دیتے ہیں؟

جواب :- تقریباً ہر روز صبح ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک۔ اُس نے کہا، اور ان افواہوں

کی تردید کی کہ اس کا باؤلی راجیو فیکٹری کی نگہداشت کر رہا ہے۔ یا یہ کہ فیکٹری برلا فیمیلی کے پاس

چلی گئی ہے۔ لیکن سیاسی اور سماجی کاموں میں اس کا زیادہ وقت گزر رہا ہے۔ اور اگر حالات

بدلتے رہے، تو بھئی گاندھی صنعتکار سے زیادہ سیاست کار کے طور پر ابھرے گا۔

سوال :- کیا آپ پارلیمنٹ میں شامل ہونے کی کوشش میں ہیں؟

جواب :- کیسے؟ وہ حقوڑا سا پریشان دکھائی دیا۔

سوال :- راجیو سمجھا کے دے دیتے۔ میں نے اندازہ لگایا۔

جواب :- ہرگز نہیں۔

سوال :- لوگ سمجھا؟

جواب :- وہ کیسے؟

سوال :- ضمنی انتخابات کے ذریعے۔

جواب :- ہرگز نہیں۔

سوال :- تو پھر عام انتخابات میں۔

اُس نے محسوس کیا، کہ میں اُسے سیاسی بیان دینے کی طرف مائل کر رہا ہوں۔ وہ مسکرایا

اور خاموش رہا۔ میں نے کہا تھا کہ اس کا انٹرویو لینا نہایت مشکل ہے۔ میں نے ایک بار پھر موضوع

تبدیل کیا۔

سوال :- مائنسٹریال میں ہماری مایوس کن کارکردگی پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے، یا کہ آپ کو کھیلوں سے

کوئی دلچسپی نہیں؟

جواب :- مجھے کھیلوں میں دلچسپی ہے۔ سکول کے زمانے میں بالنگ اور ہیرا کی کاشتقین تھا۔

مجھے ہاکی میں شکست کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہاکی سے یہاں سے کچھ ہٹا

دیا جاتے، تو شاید ایک دو نمونے آتے۔ میں نے پہلووالوں کو ملک سے باہر بھیجنے کی بات کی تھی۔

لیکن مجھے بتایا گیا، کہ وہ پہلے ہی ناکام ہو کر آچکے ہیں۔ اُس نے کدے اُچکاٹے اور مسکرانے لگا۔

سوال :- میرے خیال میں آپ سُرخ فینے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آپ نے دہلی

سے بلند شہر تک ایک ماہ میں سرک بٹوائی ہے؟

جواب :- میں نے نہیں، حکومت نے بٹوائی ہے۔ اُس نے مداخلت کی۔

سوال :- ایک ماہ کے قلیل عرصے میں تو ایسے منصوبوں کی کاغذی کارروائی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ مناسب

کہ آپ ایک بہت بڑی قوت کی مانند اس کے دیکھتے تھے۔

جواب :- لوگ ایسا سوچتے ہوں گے۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے مایوس کیا۔ مگر میں قہر جاری رکھتا

سوال :- میں نے سنا ہے کہ سیر و سیاحت کی وزارت میں ہیئت سے کام لیتا ہوں۔ بڑے تھے۔

اور وہ آپ کی پاپ کے باعث جلد پاپ سیکمیل کو چمپے۔ کیا ایسا ہوا ہے۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو

آپ اتنی سائل میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔

جواب :- بہت سی جگہوں پر کام ہو رہا ہے۔ دہلی میں پہلے دو ماہ یعنی مئی اور جون میں ۱۰۰

سے تین سو کلومیٹر سرحدیں تعمیر ہوئی ہیں۔ تیس کالونیوں میں بھی سڑکیں بنی ہیں۔ جہاں وہ نوک سٹوٹ
ہوئے ہیں۔ جنہیں لٹین علاقوں سے نکالا گیا تھا۔ اب ان کالونیوں میں ساڑھے سات لاکھ کے
قریب لوگ رہ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیہی کے ترقیاتی ادارے نے کیا ہے۔

سوال :- لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت کے کاموں میں آپ کی مداخلت ہے۔ آپ اس الزام
پر کیا کہیں گے؟

جواب :- ناراض ہونے کی بجائے اس نے آرام سے کہا۔ میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ میں کسی قلم
بھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کروں گا۔

سوال :- ایسے ہی لوگوں کا کہنا ہے کہ اس پر اپنی زندگی کی دھمے آپ کے ان اچھے کاموں میں رکاوٹ
پیدا ہوئی ہے۔ اور اب آپ نے دلچسپی لینی چھوڑ دی ہے؟

جواب :- وہ ایک بار پھر بڑبڑا۔ وہ مسکرایا۔ میں جو کام پہلے کر رہا تھا، وہی کر رہا ہوں،
اور ایسی باتیں مجھے پریشان نہیں کرتیں۔

سوال :- آپ پارٹی میں کوئی عہدہ کیوں نہیں لے بیٹھے، تاکہ پارٹی کی کارکردگی بہتر ہو سکے؟

جواب :- میں پہلے ہی ایک پارٹی کا عہدہ دار ہوں۔ میں یوٹھ کانگریس کی نیشنل کونسل کا ممبر ہوں۔
سوال :- پارٹی کی ایگزیکٹو میں کوئی اعلیٰ عہدہ کیوں نہیں؟

جواب :- میں اپنے کام میں مگن اور چپٹ ہوں۔ میں زیادہ بڑی ذمہ داری نہیں نبھا سکتا۔

سوال :- آپ نے حال ہی میں کہا تھا کہ برگ لوگوں کو نو جوانوں کو راستہ دینا چاہیے؟

جواب :- میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں نے کہا تھا کہ بزرگوں کو چاہیے کہ اگر نو جوان آگے آ رہے ہیں،
تو ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ ان کے راستے میں رکاوٹ نہ ہوں۔

سوال :- حکومت میں، یا پارٹی میں؟

۲۰
میں کانگریس کے ریفرنس سے بات کر رہا تھا۔ کسی خاص شخص یا تنظیم کی بات نہیں تھی۔
میں یہی چاہتا ہوں کہ بڑھی نسل نو جوان نسل کی حوصلہ افزائی کرے۔ بدقسمتی سے اب
میں ہورہا۔ وہ نو جوانوں سے لائق ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی لڑائی خود سر کرے گا
یہ تو بے شک آئے۔

سوال :- آپ کانگریس کی صدارت کے لئے مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟

جواب :- میں نے قبضہ لگایا۔ یہ مصحکہ خیز ہے۔ سوال میری دلچسپی کا بھی تو ہے۔

سوال :- کیا آپ کانگریس کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟ کیا اس کی تنظیم نو کی ضرورت نہیں؟

جواب :- کہیں نہیں۔ جیسا کہ میں نے سمجھا وہ میں کہتا تھا۔ کانگریس کو تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ آپ

ہندوستان میں جہاں کہیں بھی چلے جائیں، یوٹھ کانگریس کو کانگریس کی نسبت زیادہ فعال پائیں گے۔

حالانکہ اس سے اُلٹ ہونا چاہیے۔ کانگریس کو زیادہ فعال اور یوٹھ کانگریس کو اس کے پیچھے ہونا چاہیے۔

سوال :- آپ آگے اگر اس کے لئے کچھ کہیں نہیں کرتے؟

جواب :- یوٹھ کانگریس کی ذمہ داری ہی میرے لئے بہت ہے۔

سوال :- کانگریس کی مشینری ایسا کیوں نہیں کر رہی؟

جواب :- میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا جواب کانگریس کے صدر سے معلوم کریں۔

میں یوٹھ کانگریس میں ہوں۔ اور اس کے ارکان کانگریس سے مختلف ہیں۔

سوال :- مجموعی طور پر کانگریس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب :- یہ کانگریس کے صدر کے سوچنے کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، کہ ہم انتہا پسند

لوگوں کو یوٹھ کانگریس میں نہیں آنے دیں گے۔ بہت سے انتہا پسند آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہر ہی ممبر شپ لاکھوں لوگوں تک ہے۔ اس لئے ہم ہر آدمی کی تفتیش و تحقیق نہیں کر سکتے۔ جو کوئی

رکن مناجا ہوتا ہے، بنا ہے۔ لیکن ہمارے عہدے داروں میں کوئی انتہا پسند نہیں ہے۔

سوال :- دور دراز علاقوں مثلاً مہاراشٹر، تامل ناڈو اور بنگال میں یوتھ کانگریس کی پٹنچ ہے؟
جواب :- آہستہ آہستہ ہر جگہ پر رکنیت ہو رہی ہے۔ مہاراشٹر میں تو اس کی حالت بہت اچھی ہے۔ بہت سے علاقوں میں یوتھ کانگریس کے اراکین نے پانی محفوظ کرنے کے لئے بند اور ٹینک بنائے ہیں۔ سڑکیں تعمیر کی ہیں۔ تامل ناڈو میں یوتھ کانگریس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اس کے ابتدائی اثرات بہت اچھے ہیں۔ ابھی انتظار کریں گے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ بنگال میں صور حال بالکل مختلف ہے۔ تمام علاقے میں سیاسی ماحول ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام سے ریہہ سیاست کا عمل دخل ہے۔ لیکن یوتھ کانگریس نے کچھ سماجی کام شروع کر رکھے ہیں۔ یہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ ہم اچھے کارکنوں کی جماعت ہیں۔

سوال :- آپ کے ایک بیان کے مطابق جو کہ آپ نے ”سورج ماکو دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ پارٹی میں انتخابی پسند بائیں بازو کا قبضہ ہے۔ جس کی لوگوں کو تنویر ہے۔ لیکن بعد میں آپ نے اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب :- میں نے کسی چیز کے بارے میں اپنے نظریات میں تبدیلی نہیں کی۔
سوال :- کیا آپ نے پارٹی کے نئے رقوم اچھی کرنے میں اصلاحات کی ہیں؟
جواب :- میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ ہی اب کرنے کی سوچ رہا ہوں۔

سوال :- کانگریس میں بائیں بازو کے حامی اور کمیونسٹ اس بات سے نالاں ہیں کہ آپ اپنی سیاسی سوچ کو کوئی ٹیبل نہیں دے رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر سیاست میں کام نہیں ہو سکتا؟
جواب :- یوتھ کانگریس بغیر کسی ”ازم“ کے اپنا کام بغیر داخلی بھڑائی ہے۔

سوال :- تو میاں کے بارے میں آپ کی رائے کیسی ہے؟

جواب :- جس چیز کو قوم میاں میں؟ کیا قیمتوں میں اضافے کے لئے؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ کیا ہمارا مقصد ہر حالت میں کم قیمتیں نہیں ہونا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو ہر کوئی ہی طریقہ ہو، مقصد حاصل ہونا چاہیے۔ اگر تو میاں کے جانے سے ایسا ہو سکتا ہے، تو میں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ ہر روز

کی حالت سدھارنے کے لئے جو بھی طریقہ اپنایا جائے، میں اس میں شامل ہوں۔
میں نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

سوال :- آئین میں مجوزہ ترامیم کے متعلق آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟
جواب :- میں آئین کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔

سوال :- کیا آپ کے خیال میں کسی تبدیلی سے پہلے ریفرنڈم ہونا چاہیے؟
جواب :- میرے خیال میں ریفرنڈم کی ضرورت نہیں۔ ایک عام آدمی جو قوانین کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو، اس کی رائے اتنی اہم نہیں۔ میری مثال لیجئے۔ میں قانون کے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ میں کوئی دیح کوئی جیت کر سکتا ہوں۔ لیکن زیادہ گہرائی میں نہیں جاسکتا۔ یہ تو کسی ماہر کا کام ہے۔

سوال :- کیا ایسی کمیٹی کی تشکیل ضروری نہیں، جو تمام پارٹیوں کی طرف سے تہذیبی و باورنگی کرے؟
جواب :- اگر پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت حق میں ہو، تو ہر فرقہ نہیں پڑتا کہ پارٹیاں زیادہ ہوں یا ایک ہی پارٹی کا فیصلہ ہو۔ ہر حالت میں پولریشن سے بات ضروری ہے۔

سوال :- تیشنی ماہرین سے رائے لینے میں کیا مضائقہ ہے؟

جواب :- یہ تو اس پر منحصر ہے کہ وہ آئینی ماہرین کون ہیں۔ ماہرین میں سے کچھ تو اتنے جانبدار ہیں کہ ان کی رائے نہیں لی جاسکتی۔ اور اگر کوئی سچے ماہرین نکل بھی آئیں، تو ان کے پیروکاروں کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ تو پھر ان کی رائے یا مدد کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ یہ حال اپوزیشن کا ہے۔ تاہم ہر طبقے سے رائے لینی چاہیے۔

سوال :- کیا آپ نے ”اسٹریٹجی“ میں سب سے مشہور ”بھارت“؟

جواب :- ”ن“ میں نے سرسری نظر سے دیکھا تھا۔

سوال :- صدارتی نظام حکومت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ہمارے لئے یہ مفید نہیں؟
جواب :- ذاتی طور پر میں اس کے حق میں ہوں۔ لیکن یہ ہر صورت کے مفاد میں ہے۔ لیکن اگر آپ بالفرض فرانس کا نظام اپناتے ہیں، تو ہر اسے بد کر دیتے ہیں، یا القوامیں ڈال دیتے ہیں، یا

جواب :- میں سب ہی اخبارات دیکھ لیتا ہوں، لیکن کسی خاص کے حق میں نہیں ہوں۔ میں رسالوں پر سے کار زیادہ شوقین ہوں۔ بس کبھی نظر آجائیں، تو پڑھ لیتا ہوں۔

میں انٹرویو کے اختتام پر آ بیٹھا۔

سوال :- آپ کے خیال میں آزادی سے اب تک ہماری سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟

جواب :- ہم نے زراعت اور صنعت کے میدان میں نہایت ہی مضبوط معاشی بنیاد تعمیر کر لی ہے۔ یہ بنیاد بہت سے دوسرے ترقی پذیر ممالک حتیٰ کہ چین سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ مثال کے

طور پر ہم نے خشک سالی کا مقابلہ تو ترقی پذیر ممالک کی نسبت زیادہ اچھی طرح کیا ہے۔

خشک سالی سے دوران ہماری غذائی ضروریات صرف ایک یا دو فیصد کم تھیں۔ یورپی ممالک میں

اب تک کیا ہو رہا ہے۔ ان کی کمی دس فیصد تک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری بنیاد زیادہ

مضبوط ہے۔ ہمیں صرف پاکستان کے ساتھ مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں چین سے بھی مقابلہ کرنا،

چاہیئے۔ جن کی آبادی تقریباً ہمارے برابر ہے۔ ان کا رقبہ ہمارے رقبے سے زیادہ ہے۔ اور

ان کی آبادی ہم سے کم گنجان ہے۔ ہماری صنعتی بنیاد ان سے زیادہ وسیع ہے۔ چین نے سٹیل، ہیموئی

انڈسٹری اور دفنار میں زیادہ ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ بشمول تعلیم وہ سرچشمے میں ہم سے نیچے

ہیں۔ اگر کارخانوں اور مصنوعات کا مقابلہ کیا جائے تو ہمارا پلہ بہت بھاری ہے۔

سوال :- آپ کے ذہن میں اصل بھارت کیسا ہونا چاہیئے؟

جواب :- میں چاہتا ہوں کہ گاؤں ترقی کریں اور خود کفیل ہوں۔ ہریانہ اور پنجاب نے دیہاتوں

میں سڑکوں کے جال پھاد دیئے ہیں۔ دیہاتی معاشیات کے لئے یہ ایک نہایت ہی صنعت بخش

ترقی ہے۔ یورپی میں ابھی تک دیہات کا استحصال ہو رہا ہے۔ ابھی وہاں کس دن کم قیمت پر

فصل بیچتا ہے۔ اور خریدار منڈیوں میں لاکر زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ کسان کو من سب

قیمت میسر نہیں آتی۔ البتہ جنوبی بھارت کے دیہاتوں کے بارے میں مجھے علم نہیں۔ ہاں، اگر ہمارے

چار گزنی منصوبے پر عمل درآمد ہو جائے، تو ہمارے پچاس فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

بندوبست کی نالی پر رکھ دیتے ہیں تو اس سے فائدہ؟ اس میں اپنے حالات کے مطابق ترمیم کی ضرورت

ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ کیا کیا تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ کیونکہ یہ معنوں میں علم سے باہر ہے

سوال :- کیا ہمارے لئے صدارتی نظام حکومت کی طرف گامزن ہونا ممکن ہے؟

جواب :- نہیں۔

سوال :- آپ حال ہی میں سوویت روس سے ہڑکرائے ہیں۔ آپ اس پر عمل؟

جواب :- ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے ہو رہا ہے۔

سوال :- مختلف شعبوں میں ان کی ترقی کی نسبت کیا ہے؟

جواب :- روس کے شہر بہت ترقی یافتہ ہیں۔ بعض شعبوں میں ان کی ترقی نمایاں ہیں، بعض

میں کم۔ ہائڈرو پاور اور ہیموئی انڈسٹری میں زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ انہوں نے کئی بڑے شہر بھی

بنا دیئے ہیں۔ لیکن سڑکیں بنانے میں وہ کمزور واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس میدان میں ہم سے بہت

نیچے ہیں۔ اگرچہ ان کا علاقہ ہم سے کہیں زیادہ ہے، لیکن وہ ہم سے کہیں نیچے ہیں۔

سوال :- آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب :- یہ تو منصوبہ بندی کے مختلف نظریات کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے۔ بھارت ہم سڑکوں کو

زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ کم۔ میں ذاتی طور پر سڑکوں کی تعمیرات سمجھتا ہوں۔ میں روس کے حالات

کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس لئے مجھے ان کے حالات کا علم نہیں۔ انہوں نے اپنے شہروں اور قصبوں

میں فاصلے سڑکوں کی نسبت ہوائی رابطے سے کم کیئے ہیں۔

سوال :- جس طرح آپ نے درخت بچاؤ سکیم شروع کی ہے۔ کیا اسی طرح شکار پر مکمل پابندی

لگا کر آپ پرندوں کا تحفظ نہیں کر سکتے؟

جواب :- میں مکمل طور پر اس کے حق میں ہوں۔ لیکن لوگوں کے لئے اس میں مشکلات ہیں۔ یہ

حکومت کا کام ہے۔ یونٹ کا انگریز وہی کام کر سکتی ہے، جس میں لوگ شامل ہوں۔

سوال :- آپ کون سے اخبارات کا مطالعہ پسند کرتے ہیں؟

سوال :- مہاراشٹر کے جبری نس بندی کے قانون کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟
 جواب :- جبری نس بندی بہتر ہے، اگر اس کی پشت پناہی پر تمام مراعات ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ مہاراشٹر کے دیہاتوں میں یہ مراعات پہنچی ہیں کہ نہیں۔ ان کے بغیر جبر کی ضرورت نہیں۔
 میں آخری سوال کی طرف آتا ہوں۔

سوال :- یہ خیال عام ہے کہ آپ پنجاب کے "داماد" ہونے کی بنا پر اس صوبے کے لئے جانبدار ہیں۔ اور کٹر یہاں آتے رہیتے ہیں؟

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ جیسے پنجابیوں کے سامنے اس جانبداری کا اقرار کرے گا۔ مگر وہ سکرایا جواب :- ایسا ہرگز نہیں۔ یوپی، آندھرا، کرناٹک، ہماچل، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں ہر جگہ اتنی ہی مار گیا ہوں، جتنی بار پنجاب۔

یہ انٹر ویو دو رافوں میں دو گھنٹوں میں مکمل ہوا۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکا۔ اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے جاننے والوں سے اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلوم کروں۔ سنیے گا۔ مدھی دہلی کے ویسٹمن ہسپتال میں چودہ دسمبر ۱۹۲۴ء کو صبح نو بج کر ستائیس منٹ پر پیدا ہوا۔ اس کا برج قوس ہے۔ جو فلم سٹار راجکپور کا ہے، جو ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا۔ سنیے کے بارہ سوپ کے مطابق وہ کھیل پسند، پرواز کرنے والا، بے تکلف مگر فلسفی ہو گا۔ ۱۹۷۶ء بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرے گا۔ اس وقت زبان زمر خلق ہو گا۔ قانونی مسائل میں پھنسے گا اور بالآخر زمانے کو اپنے پیچھے دھکے گا۔

"سنیے" ام مہاراشٹر سے لیا گیا۔ اس وقت وہ لوگ اپنے نانا جواہر لعل نہرو کے ہاں، وزیر اعظم کی آر می رہائش گاہ، پارک روڈ پر سہستے تھے۔ جب سنیے دو سال کا ہوا، تو گداز جم دنی محنت مند و مدد مندھی نے بطور امیر استقبال گھر کا چارج لیا۔ وہ اس خاندان کے ساتھ ۱۹۷۳ء تک رہی۔ آج کل وہ وزارت امور خارجہ میں ڈائریکٹر ہے۔

میں نے جانبداری ٹھکرا سے درخواست کی کہ وہ ملا سے سنیے کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے

تہہ کرانے۔ وہ ملا کا کہنا ہے کہ سنیے مشینوں درجہ اول کی مرمت میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اپنے کمرے میں ایک درکشاپ بنا رکھی تھی، اور ہر وقت قبربات میں مگن رہتا تھا۔ ہم اکثر تہہ تہہ ہیں اسے مرمت کرنے کے لئے دے دیتے۔ اور وہ اس کمال سے DURAFIX لگاتا کہ وہ بے معلوم ہوتی۔ اس نے یہ تکنیکی رقبان اپنے والد نیروز گامدھی سے دسٹے میں کیا۔ اس نے ایسے ہی کی مدد کی۔

سنیے کا بھی ایک شیرازہ شرح لڑا کا تھا۔ وہ مانتی ہے کہ ایک دفعہ تیرہ برس وہ اپنی کسی سہیلی کے لئے سوئیٹر بن رہی تھی۔ سوئیٹر نکھیل کے آخری مرحلے میں تھا۔ ایک روز وہ میری کچھ دیر سونے کے بعد میں کھلی تو سوئیٹر نڈار۔ میرا گمانہ ہی ہے معلوم ہوا کہ سنیے اور راجیو نے سوئیٹر اڈھیڑ دیا تھا، اور پام کے درختوں کے گرد مارا دون لپیٹ دیا تھا۔ صرف یہ معلوم کرے کے سنیے کہ وہ آخرا کرتا چل چل کر دن اکھاڑی۔ پہلی کا ہوا ہر روز۔ میں بہت مقبول تھا۔ ان کے وقت پر سنیے نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تالا کے کنارے آکر کوئی چیز دیکھوں خود بخود دکھانا چاہتا تھا۔ میں سے پہلے کہ میں کچھ بانی، کہ کیا ہونے والا ہے۔ سنیے نے مجھ سے دعا دے دیا اور دونوں لوگوں نے میرے اوپر رنگ پھینکنے شروع کر دیئے۔

ان ستر قوس کے باوجود سنیے میں ایک لوجوان مرد کی طرح احساسِ ذمہ داری بھی تھا۔ ایک دفعہ ہم لکھنؤ میں تھے تو مسز گامدھی نے حکم دیا کہ فوراً کوئے کرا لہ آباد پہنچیں۔ میں ان کے ساتھ سفر کرنے سے بچکوبہ رہی تھی۔ "دو تہم کیوں تھر مدہر؟" سنیے نے پوچھا۔ میں ٹکٹ خریدیں صفا۔ اور بھائی (راجیو) سناں کلانی تھکے خانے گا۔ سارا کام دونوں نے کیا، اور میں آرام سے بیٹھی رہی۔ ہم ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے۔ کیونکہ میرا گمانہ ہی تھا کہ سنیے کا مزاج خراب نہ ہو، نہیں چاہتی تھیں۔

راجیو اور سنیے سخت ڈیلیں کے وقت پر راج حیدر ہے۔ وہ کبھی پارٹیوں میں شامل نہیں ہوتے تھے، تو وہ عمر میں ہی کیوں نہ ہوں۔ دونوں خوں کو کھلے دکھانے کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کی والدہ امیز DAD - YOURSELF نام کی کتابیں لائبریری تھیں۔ جب سارا خاندان وزیر اعظم کی سٹی ہاؤس میں رہا، تو آج کل ہندو میو یو میں ایک عکس ہو گیا، تو سٹاف کو پتہ چلا جاتا، تاکہ وہ دیکھیں کہ وہ نہیں

نے آج کیسا پایا ہے؟ دونوں مائی ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔

سنے وقت کلبے حد پائند تھا۔ اگر کار سے سکوں سے سینے میں پھرتا تو وہ آگ میں دیتا۔ اور ہر ایک سے پوچھتا پھرتا، حتیٰ کہ دیر کا سبب معلوم کر لیتا۔

چاندنی پھر وہ جیوں لعل عمر کی خبر من مہ دیوی اس وقت کا سبب بھی مانی۔ یہ خانہ اس زمانے میں سرزن رد و ہزینوں کے سکول "ٹوئینٹن" کی بنیاد چھوڑ گئے تھے۔ وہ دس سال رہیں گزرا۔ بے گھر ہو کر رہا۔ اس میں سبھی اچھے اور بے گھر ہو کر رہا۔ لیکن اس نے بے پناہ خود اعتمادی تھی۔ اسے خود اعتمادی کے لئے اسے شرت کی ضرورت تھی۔

اس نے بچہ گاہ کے مطابق سب سے زیادہ جانوروں سے زیادہ پیار رکھا۔ وہ بہت رحمدل تھا۔ سزا کا اس بات سے اختلاف کرتی تھی کہ دونوں مائوں میں کوئی خاص قریب تھی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہر راجیو عام طور پر کھیل میں شریک رہتا تھا۔

وزیر اعظم کے خصوصی اپنی اور بہن و خاندان کے دوست محمد یونس کے بیٹے عادل شہر یار کا کہنا ہے کہ سب سے کاموں کے ساتھ بے انتہا لگن تھی۔ وہ کار کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی اس نے اپنی کھڑا گاڑی کو کھول کر اس میں بیڑی فٹ کر دی تھی۔

۱۹۷۳ میں وہ کہیں سے ایک نیواریسی کار لے آیا۔ وہ جامع مسجد کے قریب بازار میں اس کے سپر پارٹس ڈھونڈتا پھرا۔ اس نے اس کار کو ٹھیک کر لیا۔ اور ہم اس پر پتھر کی سیڑی کھینچ رہے تھے۔ سبھی خطرات میں کودنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ گاڑی تیز رفتاری سے جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک چپ اس کے ساتھ آئی۔ اس نے ہل چلتیوں اور سنگلاخ پہاڑوں کی پٹریوں پر دوڑائی۔ اس کا کمرہ دانتا پ تھا۔ چیزیں توڑنے میں ہم دونوں (عادل شہر یار) ایک ہی دھن کے مالک تھے۔ ایک دفعہ اس نے پہلی کاپیٹینا نے کی کوشش بھی کی۔

عامل کے مطابق سبھی صرف اس کام میں دلچسپی لیا، جس میں مسائل سے بچنے کی گنجائش زیادہ ہوتی۔ جو ہنی وہ مسائل سے مہرہ تر ہو جاتا۔ تو سارے کام کسی اور کو دے دیتا تاکہ تکلیف نہ

ہو۔ اور سب سے بڑے مسئلے میں کندھوں ہوتے۔ وہ بہت دہیں اور خود کھیل شخص تھا۔ کہ لوگ اس کی صاف گوئی سے سے پائند تھے۔ لیکن وہ مشور نہیں تھا۔ اگرچہ وہ آسائشیات میں بیرون چڑھا، مگر وہ گاڑی کی شرح سادگی پسند تھا۔ عادل شہر یار کے خیال میں گھر میں کوئی خاص ڈسپین نہ تھا۔ اگرچہ اس نے سب سے زیادہ شہر نہیں۔ ہر کوئی اس سے خوف کھاتا تھا۔ صرف راجیو اسے ڈانٹ سکتا تھا۔ وہ اکثر اوقات ایسا کرتا رہتا تھا۔

سب سے نفیس جوڑا کاشٹق نہیں تھا۔ وہ مٹھکا خیر حد تک انداز کا شوق تھا۔ وہ دن میں، لاٹھیاں لٹکے کھا سکتا تھا۔ مگر اس میں شراب یا سگریٹ پینے کی عادت بالکل نہیں تھی۔ سب سے ایک اور بچہ کادوست، سناٹا ہے کہ اس کا کمر کھلونوں سے اٹا ہوتا تھا۔ مگر وہ کھلونے چھوڑ کر سہرنگوں اور ہیراں لٹکوں میں مصروف رہتا تھا۔

سب سے "دوت" لٹکے۔ واقعتاً ایک دن وہ میرے پاس سیکنڈ ہینڈ لیٹر دوڑ میں آیا۔ پورے بچے بھراہ چلنے کو کہا۔ وہ جیب دست دھار کی پہاڑی کی چوٹی کے قریب، والی سڑک پر لے گیا۔ اور ہیراں سے سڑک کھلا چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے بریکیں کام کر رہی تھیں۔ ورنہ میں آج یہ قلعہ سنانے کو موجود نہ ہوتا۔

مجھے کو سا نگہ کا قلعہ دینا ایک نہایت مشکل بات تھی۔ وہ ایسی کسی بات کو پسند ہی نہ کرتا تھا۔ اگر آپ اسے کوئی چیز دے دیں تو ہو سکتا ہے، وہ کسی ایسے شخص کو دے دے، جو اس کی تعریف کر دے یا اسے پہلے نظر آجائے۔

سب سے میں ایڈر پھر کی صحیح سیرٹ تھی۔ ایک دفعہ ہم سب کار بیٹ یا رک گئے، تو آدمی رات کو سب سے ہائی کنگ کے لئے گیا، اور ہم سب نے دنیا کے ساتھ ساتھ دوڑ دکائی۔

ایک دفعہ میں اس کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لئے شہر گیا۔ آدھے راستے تک وہ ہمیں پورے رات لگا کر ہم سرنگر کی طرف چلیں۔ دوست زیادہ تھے، اس لئے دوڑ ڈالنے کا منصوبہ نہ۔

اس نے سرنگر کی حمایت کی۔ جہاں جیب کا رخ سرنگر کی طرف موڑ دیا گیا، اور وہ سب

کی حفاظت نہیں کرنا چاہیے؟ کیا بد عنوانی کا خاتمہ نہیں ہونا چاہیے؟ تو پھر ایسے شخص کے لئے پر جان
کیوں جو یہ سب کچھ کر رہا ہو۔

سننے لپٹے جوان کدھوں پر بیٹ بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ اس کے سامنے ایک طویل
اور سڑا سفر ہے۔ اس کے راستے میں کیلے کے چھکے مت پھینکو۔ خوشحال بھارت کی خاطر اس کے سفر
میں اس کا ساتھ دو۔ ہم بڑھی نسل صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنے خوابوں پر عمل پیرا
ہونے دو۔

گورو گول والکر

بچہ دل ایسے ہوتے ہیں جن کی کسی خطا کے بغیر ہی ہم ان سے نفرت کرتے ہیں۔
ایسے ہی لوگوں میں گورو گول والکر میرے لیے سرفہرست تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات میں
آ۔ ایس۔ ایس کی شمولیت، جمائیکا گاندھی کا قتل، ہندوستان کو سیکولر سے ہندو ریاست
میں تبدیل کرنے کا مطالبہ۔ یہ سب باتیں اس سے منسوب تھیں۔ ایک صوفی
کی حیثیت سے میں اسے بے بغیر نہ رہ سکتا تھا

میرا خیال تھا کہ مجھے سوایام سیوکسوں (محافظوں) کی ایک فوج سے گزر کر جاتا ہوں
گاسکین وہاں تو سفید پٹروں میں ملبوس سی آئی ڈی کے لوگ بھی نہیں تھے جو کم از کم گاڑی
کا نمبر ہی نوٹ کر لیتے۔ یہ ایک درمیانے طبقے کا گھر تھا جو لو جا گھر کی طرح اندر آ رہا تھا۔ گھر
کے باہر زمانہ جو توں کی ایک قطار، اگر بتی کی خوشبو، پرے سے پیچھے عورتوں کی کھڑ
پنجرہ، برتنوں کی جھنکار، ایک چھوٹے سے کمرے میں تقریباً ایک درجن لڑکے سفید
کرتوں اور شہد دھوٹیوں میں ملبوس بیٹھے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی
بہنا دھو کر آئے ہیں اور ان کے حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے شہ کے باشندے ہیں
گورو گول والکر، سٹھ کے پیٹے ہیں ایک دھن پان سا شخص ہے۔ م کے کاسے
یہ وہاں کدھوں پر گر گھٹکھڑ بامے ہو جاتے ہیں۔ ہونہ مونچھوں کے نیچے جیسے ہونے
کچھ مٹی داڑھی لپی ہے اور ٹھوڑی کے نیچے تک جاتی ہے سگری آنکھیں اور دائی مکر
وہ ایک بھرتی ہو چکی منہ کی مانند نظر آتا ہے حال ہی میں اس نے سینے کی زہ پریشن
کرایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر چاق و چوبند نظر آتا تھا۔

چونکہ وہ ایک گرو ہے اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ ایک چیلے کی سی فرمانبرداری کا

مترق ہو گا جو نبی میں اس کے پاؤں چھونے کے لیے جھکا اس نے اپنی مضبوط انگلیوں میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ دلی کمرسی پر بٹھالیا۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی اس نے کہا مجھے اس کی خواہش بھی تھی۔ اس نے بڑی شدت ہندی میں کہا۔

مجھے بھی آپس سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے کہا۔ خاص طور سے جب سے میں نے آپ کی کتاب BUNCH OF LETTERS پڑھی۔ "BUNCH OF THOUGHTS"۔ وہ میری تصحیح کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کتاب کے متعلق میرے نظریات معلوم کرنے سے لاتعلقی ہے۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتا ہے اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ پھر۔۔۔

میری بگھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے انٹرویو شروع کروں۔ مجھے علم ہوا ہے کہ آپ شہرت سے احتراز کرتے ہیں اور آپ کی تنظیم خفیہ ہے۔؟

ج۔ یہ درست ہے کہ ہم شہرت پسند نہیں کرتے لیکن ہماری تنظیم میں کوئی خفیہ بات نہیں جو کچھ تم پوچھنا چاہتے ہو بلا تکلف پوچھو۔

س۔ میں نے جبکہ کیورن کی تحریر آریس۔ ایس اور ہندو قسطنطین میں آپ کی تحریک کے بارے میں پڑھا تھا۔

ج۔ وہ سب تعصب پر مبنی ہے۔ گورو جی مداخلت کرتے ہیں۔ غلط اور نادرست اس نے میری طرح اور بھی غلط ریفرنس پیش کیے ہیں۔ ہماری تحریک میں کوئی تشدد نہیں ہم تو ڈسپن کے قائل ہیں اور یہ تشدد سے بالکل مختلف نئے سبے۔

جبہ میں نے انہیں بتایا کہ ایک مضمون میں کیورن کو یورپ اور افریقہ میں سی آئی اے کے آپریشن کی کمان حاصل تھی تو انہوں نے کہا۔

میں ایسا شک نہیں کرتا۔ لیکن میں بڑی بے ساختگی سے کہتا ہوں۔ میں اسے گزشتہ بیس سال سے جانتا ہوں۔

گورو جی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ معلوم نہیں ان کا تعلق میرے ساختگی پر تھا یا کیورن کے سی آئی اے

کے ہمراہ ہونے پر۔

س۔ R S S کے بارے میں ایک چیز مجھے پریشان کرتی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو پوچھوں۔

ج۔ بات جاری رکھو۔

س۔ اور وہ چیز اقلیتوں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے آپ کا طرز عمل ہے ج۔ ہم عیسائیوں کے بالکل خلاف نہیں۔ لیکن جب وہ کسی بیمار کو دوا یا بھوکے کو خوراک دیتے ہیں تو اس وقت اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں گو یا صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیں کھٹکتی ہے مجھے خوشی ہے کہ بھارت میں گرجا گھروں کو رام کے زیر اثر سے آزاد اور خود مختار بنانے کی تحریک ہوئی ہے۔

س۔ اور مسلمان۔

ج۔ ان کے بارے میں کیا الزام ہے۔؟

مسلمانوں کی پاکستان اور بھارت دونوں کے ساتھ وفاداری پر انہیں الزام نہیں دیا جاسکتا کیونکہ تاریخی عناصر کے حساب سے ہندوؤں پر بھی اتنا ہی الزام عائد ہوتا ہے تیسیم سیکس لے کر اب تک انہیں عدم تحفظ کا احساس رہا ہے۔ لیکن پھر بھی جینڈ لوگوں کے جبرم کی منہ تمام قوم (مسلمانوں کی) کو نہیں دی جاسکتی

س۔ گورو جی۔ بھارت میں جھگڑوں کے قریب مسلمان ہیں۔ میں ذرا جوش میں آتا ہوں۔ ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں نکال نہیں سکتے۔ ہم انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا گھر ہے۔ ہمیں ان کو تحفظ دینا چاہیے کہ وہ اسے اپنا گھر سمجھیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں محبت سے فتح کریں۔

ج۔ میں اس کے بالکل آگے ہوں۔ گورو جی مداخلت کرتے ہیں۔ اھوولی گورو جی ہمیں کہا۔ مسلمانوں کی مدد سے ان کو مطیع بنانا چاہیے۔

س۔ چھانا ہوں کیا گورو جی انہوں سے کھیل رہے ہیں۔ ادا تمی جو کچھ انہوں نے ہے وہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بات لی وفاق کر رہے ہیں۔ تو مدت

اسلامی کا ایک وفد مجھے ملنے آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ مسلمانوں کو بھول جانا چاہیے کہ وہ کبھی ہندوستان پر حکومت کرتے تھے اور نہ ہی انہیں دوسرے مسلمان محاکم کو اپنے وطن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انہیں ہندو مت کی بالادستی قبول کرنی چاہیے۔
سے وہ کیسے۔

ج: ہمیں انہیں سمجھانا چاہیے۔ بعض اوقات ہم مسلمانوں کے اعمال پر سخت برہم ہوتے ہیں لیکن ہندوؤں کا خون دائمی نفرت نہیں رکھتا۔ وقت بہت بڑا برہمنہ میں رجائیت پسند ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ہندو مت اور اسلام ساتھ ساتھ رہنا سیکھ جائیں گے۔ چائے پیش کی جاتی ہے۔ گورو جی شیشے کے مگ میں چائے پیتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے باقی سب کی طرح چینی مٹی کے کپ میں چائے کیوں نہیں پی۔ وہ مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ اس کپ میں چائے پی ہے اور جہاں کہیں جاتے ہیں اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا قریب ترین رفیق کارٹاکوٹھ جس نے اپنی زندگی کے بے وقفہ رکھی ہے وضاحت کرتا ہے کہ پورسلین بہت آہستہ اپنی سطح جھوڑ دیتی ہے اور نیچے کی مٹی نمایاں ہو جاتی ہے جو جرائم پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ میں اپنی گفتگو کی طرف لوٹتا ہوں۔

س: آپ مذہب کو بنیاد ہی کیوں بناتے ہیں جبکہ دنیا میں ہر جگہ مذہب سے اجتناب ہوتا جا رہا ہے۔ لا اوریت کا دور دورہ ہے۔

ج: ہندو مت کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں کیونکہ اس کے کوئی نظریات نہیں پہلے اس میں لا اوریت تھی۔ اگر مذہب سے اجتناب کا دور آگیا تو ہندو مت اس کا بہتر مقابلہ کر سکتا ہے۔

س: یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں دنیا میں جتنے مذاہب کو استحاط حاصل ہوا ہے یا انہوں نے لوگوں پر گرفت مضبوط کی ہے ان کے نیچے نظریات ہی تھے مثلاً کیتھولسزم اور کیتھولسزم سے بڑھ کر اسلام۔

ج: یہ مجبوری دور ہے۔ لا اوریت ان پر قبضہ کرے گی لیکن ہندو مت اس کے نیچے

میں ہیں آئے کی ہمارا مذہب۔ معروف معنوں میں مذہب نہیں یہ تو دھرم ہے۔ زندگی نہ رہنے کا طریقہ۔ ہندو مت لا اوریت کو اپنی تفسیر پر مجبور کر دے گی۔

مجھے گورو جی کے پاس نصف گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا ان کے چہرے پر بے مہرگی یا انکسائٹ کے کوئی آثار نہیں جب میں ان سے اجازت لیتا ہوں تو وہ ایک بار چوڑی لالٹن پکڑ لیتے ہیں تاکہ میں ان کے پاؤں نہ چھوؤں۔

کیا میں ان سے متاثر ہوا تھا؟ ہاں میں مانتا ہوں۔ انہوں نے اپنا نقطہ نظر مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ناگپور میں ان سے ملاقات کی پیش کش منظور کر لی۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد جو کہ کا بنیادی مقصد ہے۔ میں کامیاب ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں انہیں اس بات پر مجبور کروں یا ہو سکتا ہے کہ میں ایک عام ذہن والا سیکھ ہی ثابت ہوں۔

جے پی - ایک مکمل انقلابی

گذشتہ سال بھارت کی تقدیر بدل دینے والی دو اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

پہلی :- جے پی نے عوامی تحریک میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اگر اسے کامیابی ہو تو ہمارے آئین سازوں کی جمہوریت کو تازہ کر دے گی۔ جے پی اور اس کے پیروکار اپنی بے پناہ تحریکی طاقت کا اندازہ نہیں رکھتے۔ جو جیسا بھیں گے، ویسا ہی کایں گے۔

دوسری :- حکمران جماعت لیج کانگرس اور سی پی۔ آئی — جے پی کی طاقت کا شعور نہیں رکھتے۔ ایک ہلکے کی طرح طوفان دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

بھارت کے شہریوں کو جے پی کی انقلاب کی دعوت پر غور و فکر سے کام لینا چاہیے۔

جے پرکاش نرائن ایک عظیم آدمی اور اچھا انسان ہے۔ وہ ایک دھڑلے والا ہے۔ اور اس

نے کبھی ناپسندیدہ کاموں میں ہتھ پڑی نہیں دکھائی۔ اُس نے صرف بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالا

ہے۔ مثلاً شیخ عبداللہ کی گرفتاری۔ ناٹک لینڈ میں بھارتی فوجوں کا ناگوار قتل عام۔

پاکستان کو ہر ایک دشمن سمجھنا، درجہ دیش کی جنگ آزادی، جس کی وجہ سے وہ پاکستان میں

سب سے زیادہ نفرت کیا گیا۔

نیپال کے سابق وزیر اعظم نے اُسے ہر صغیر کی علیحدہ انگ۔ توانا آواز کہا۔ دنیا ہر کی

جمہوریتوں میں سب سے زیادہ جمہور کی آواز۔ آندری میلرکس نے اُسے گاندھی کے بعد

جے پرکاش تحریک آزادی ہند میں شامل تھا۔ مہاتما گاندھی نے جب طالب علموں کو

کالج چھوڑ کر تحریک چلانے کو کہا، تو اس نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ ۱۹۲۲ کی تحریک

درہندوستان چھوڑ دے، کاسب سے بڑا روح رواں تھا۔ (جب اُس کے اصل دشمنوں اور اہلکل

کے کمیونسٹوں نے انگریزوں سے ساز باز کی تھی) ۱۹۴۷ میں اُس نے ذاتی حثیت میں بہار کے

کئی قحط زدہ لوگوں کو موت کے منہ سے بچایا۔ اس نے کئی سال سرورید اور عبودان کی تحریکوں

میں صرف کیئے۔ ۱۹۷۲ میں جنرل کی وادی کے ڈاکوؤں کا صفایا حکومت، پولیس یا فوج کی

بھلے جے پرکاش نے کیا تھا۔

ان سب مہمات نے جے پرکاش نرائن کو ایک جائز خطاب عطا کیا۔ "قوم کے

ضمیر کو زندہ رکھنے والا۔" اس نے کبھی کسی عہدہ کی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ اس لئے

دوسرے سیاسی لیڈروں کے برعکس اُس کی بے انتہا عزت کی جاتی ہے۔ وہ کون سی،

قوتیں تھیں، جنہوں نے ایک انسان کو اس درجے تک پہنچایا۔

جے پرکاش ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ کو بہار کے ایک گاؤں ستابدین میں کائٹھ گھرانے

میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک محولی سرکاری ملازم تھا۔ وہ چھ بچوں میں سے تیسرے نمبر

پر تھا۔ چند سال گاؤں کے پرائمری سکول میں گزارنے کے بعد وہ پٹنہ کے ہائی سکول میں بھیجا

گیا۔ وہ سکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر وٹ مور سے بہت متاثر ہوا۔ مہاتما گاندھی نے طالب علموں

کو تعلیم چھوڑنے اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کا حکم دیا، تو ہم نے امتحان دینے سے انکار

کر دیا۔ وٹ مور سوائے سزا دینے کے کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پہلے اُس نے ہمیں سزا دی،

کہ یہ اُس کے فرائض میں شامل تھا۔ پھر اُس نے ہماری حب الوطنی پر ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا۔

اس کے احساس فرض اور ہمارے ساتھ ہمدردی کے رویے نے ہمیں خاصا متاثر کیا۔

جے پرکاش دہرات ہے۔

اپنی شاندار جسمانی ساخت کے باوجود جے پرکاش کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

”میں اپنا فارغ وقت بھی پڑھنے میں گزارتا تھا۔ میرا باپ مجھے بڑا حال رکھا کرتا تھا۔“
پندرہ سال کی عمر میں جے پرکاش نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی، اور ایک پتے قوم پرست اور مالدار
وکیل کی بیٹی پر بھائی سے شادی کر لی۔

مہاتما گاندھی کے اس حکم پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے جے پرکاش ماضی کو یاد کرتا
ہے۔ ”فائنل امتحان دینے سے ایک ماہ قبل مولانا آزاد پٹنہ آئے اور سب جے پی سے کہا، ”جب تک،
گاندھی جی ایسے مدرسے نہیں کھولیں گے، جہاں بچوں کو قوم پرستی کی تعلیم دی جائے، لوگ کہتے ہیں،
کہ وہ اپنے بچوں کو سکولوں سے نہیں اٹھائیں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا، کہ ہم اس وقت تک
زہر پیچے جائیں گے، جب تک کہ ہمیں نکوٹین فرام نہ کی جائے۔“

جے پرکاش نے سالانہ امتحان نہیں دیا۔ اگست ۱۹۲۲ میں اُس نے گاؤں کو خیر باد کہا،
کلکتہ سے ایک جہاز پر سوار ہوا، اور دو ماہ بعد سان فرانسسکو جا پہنچا۔ وہ یونیورسٹی میں داخلے
کے لئے لیٹ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک فارم پر ملازمت حاصل کر لی۔ بعد ازاں وہ پھلوں کو محفوظ
کرنے کی فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ وہ برکلی یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔
اس لئے اس نے آئیو اسٹیٹ یونیورسٹی میں مائیکرولیش کروالی۔ وہاں چند سمسٹر گزارے کے
بعد وہ دس کم سن چلا آیا۔ ”مجھے امریکی دوست اچھے لگے۔ میں لڑکیوں کے ساتھ
ڈانس پارٹیز میں جانے لگا۔ انہوں نے میرا انگریزی نام ”میری“ رکھ دیا۔“

امریکہ میں ہی جے پرکاش ایک چمکے قوم پرست سے مکمل ملاکٹ میں تبدیل ہو گیا۔
وہ پرائش بھردی ابوروم لینڈی سے متاثر ہوا۔ لینڈی ایک ذہین طالب علم، شاعر اور کیمونسٹ
تھا۔ لینڈی نے جے پرکاش کو بھارتی کیمونسٹ پارٹی کے ورکرز یونین ایم۔ این۔ رائے سے متاثر
کرایا۔ وہی رائے جس نے بعد میں عدم تعاون کی تحریک چلائی۔ گاندھی جی کی آہنہ کی تحریک
کے بالکل مخالف۔

جے پی امریکہ کی کیمونسٹ پارٹی کے علمی شعبہ میں شامل ہو گیا۔ اس نے لینن، ٹرائسکی،

روزنا کبیرگ اور کاری کائسکی کا مطالعہ کیا۔ میں نے ”داس کیپٹل“ کے چند ابواب بھی پڑھے۔
اور ایک میکین ایمانویل گو مزے جے پرکاش کو سائنس اور حساب کی بجائے سوشیالوجی کے مطالعے
کا مشورہ دیا۔ اور اس نے اورنٹیل یونیورسٹی آف ماسکو میں داخلہ لینے کو کہا۔ اسے روس میں داخل
ہونے کے لئے چار سو ڈالر کی ضرورت تھی۔

جے پرکاش یہ رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ امریکہ اس وقت معاشی بحران
سے دوچار تھا۔ جے پرکاش ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری تک کوشش کرتا رہا، لیکن کہیں سے
مدد حاصل نہ ہو سکی۔ غیر ملکیوں اور کالوں کو روزگار نہ ملتا تھا۔ بعض جگہ پر تو ہندوؤں پر ملازمت
حاصل کرنے کی پابندی تھی۔

بالآخر جے پرکاش کو ایک جگہ چھپڑاسی کی نوکری ملی اور اس نے ادھیڑ میں کوئلیا یونیورسٹی
میں داخلہ لے لیا۔ اس نے پچھلے ڈگری کے ساتھ ساتھ وظیفہ بھی حاصل کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی
نوسٹنگ سالانہ کی گریجویٹ امداد بھی حاصل کی۔ اس نے ایم۔ اے تجزیہ کر فار کی سائنس
میں کیا، اور سالانہ امتحان میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ فارغ اوقات میں وہ کلیولینڈ کی ایک
ٹریڈ یونین کے دفتر میں کام کرتا رہا۔

جے پرکاش ۱۹۲۹ میں بہار واپس آیا۔ امریکہ کے متعلق اپنے جذبات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے، ”میں
نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس لئے کیمونسٹ مجھے امریکی ایجنٹ کہتے ہیں۔ امریکہ میں میں نے سرنگو
فیکٹریوں اور مذبح خانوں میں ملازمت کی۔ میں نے ہیراگری کی۔ اور بعض اوقات تو ہڈیوں
میں کوڑھی صاف کئے۔ یہ لوگ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ ہر مہینہ
ہو گیا۔ لیکن ٹالن نواز نہ بنا۔ جب میں ہندوستان واپس آیا، تو میں کیمونسٹ تھا۔ لیکن میں
نے کیمونسٹ پارٹی کی بجائے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔“

جے پرکاش بھارتی سیاست میں شامل ہو گیا۔ پہلے اس نے کیمونسٹوں کو دیکھا۔ متقی قتل

کے لیڈر جیل میں تھے۔ دوسروں نے اسے متاثر نہ کیا۔ اس دوران اپنے شوہر کی سات سالہ

غیر ماضی میں پر بھارتی گاندھی جی کی پیروی کا رہن گئی۔ وہ طرہ و معا کے گاندھی آئٹرم میں جے پرکاش
کو لے کر گئی۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ مختصر سی ملاقات میں ہی جے پرکاش کے اختلاف ہو گئے۔
پہلے وہ گاندھی جی کی بہت سی تعلیمات مثلاً چہرہ بافی اور سبزی خوردی کو جائز سمجھتا تھا۔ پر بھارتی
نے اُسے مجبور کیا کہ آئٹرم میں گاندھی جی کے سیکس کے خلاف نظر ثانی کو بھی مان لے۔ کچھ
دیر جے پرکاش اپنے اس نظریے پر قائم رہا کہ گاندھی جی ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے
ختم ہو چکے ہیں۔ گاندھی کے پیروکار گاندھی کو اتنا نہیں جانتے تھے، جتنا گاندھی اپنے پیروکاروں
کو۔ مہاتما گاندھی نے پیش گوئی کی کہ ایک دن جے پرکاش اُن کی زبان بولے گا۔ ۱۹۳۰
میں جواہر لعل نہرو نے بھارت کا صدر منتخب ہونے کے بعد جے پرکاش سے کہا کہ وہ کانگریس
میں شامل مزدور طبقے کی راہنمائی کرے۔ دو سال بعد وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکریٹریوں
میں شامل تھا۔ تقریباً اُسی زمانے میں کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا اور جے پرکاش
کو قید کر لیا گیا۔

ابھی وہ مارکسزم سے باہر نہیں نکلا تھا۔ جیل میں وہ سرفروں کے ایک گروپ میں شامل
ہو گیا، جو گاندھی سے اختلاف رکھتے تھے۔ سکالروں کی طرح لغزت آمیز نیچے میں اُس نے
گاندھی کو رجعت پسند کہا، اور گاندھی کے مکتوبوں کے لئے جذبہ ترم کو ایک سر پرے انسان
کی دوستی گردانا۔ گاندھی اپنے فوجان نقادوں کو صرف ایک خطاب دیتا تھا۔
”جلد باز لوگ۔“ پھر انہیں کانگریس کے سوشلسٹ گروپ میں داخل کر دیتا تھا۔
جے پرکاش گاندھی کی نسبت نہرو کے زیادہ قریب تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران
گاندھی کو قہور کر نہرو کے ساتھ نئی پارٹی بنانے میں جے پرکاش پیش پیش رہا۔ وہ سمجھتا تھا
کہ بھارت میں انقلاب کا سماجی کام اسی طرح مکمل ہو گا۔ اس نے اعلان کیا کہ گاندھی جی
کے فلسفہ کا وقت گزر چکا ہے، اب اسے زیادہ دیر جاری رکھا جاقتا ہے۔ اب ہمیں
سوشلزم کے جھنڈے تلے مارچ کرنا چاہیے۔

گاندھی، نہرو اور جے پرکاش کے خیالات جنگ عظیم کے متعلق ایک دوسرے سے
مختلف تھے۔ گاندھی آہستہ آہستہ چکر میں تھا، نہرو فاشنزم کے خلاف اور مارکسٹ جے پرکاش
اس سامراجی جنگ کو عوام کی جنگ آزادی بنانے کے دپے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اینٹی برٹا
کہتا تھا۔ سب کے سب برطانوی جیلوں میں ڈال دیئے گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی جے پرکاش کا نام بھارت میں عام ہوا۔ قند خانے میں دھوکے
کو کاغذیں لگا کر اس نے چھ میٹر لمبا رستہ بنایا اور جیل سے بھاگ نکلا۔ اس نے بڑے پیمانے پر
تبہہ کی منظم کیا۔ ریلوے لائنیں اکھاڑ دیں، سڑکوں پر بم پھینکے اور مشرقی محاذ پر فوجی دستے
اور گولہ بارود بھجوا یا۔ وہ پکڑا گیا۔ مگر وہ ایک ناقابل فراموش ہیرو بن چکا تھا۔ لیکن اسے اس
بات کا اندر اک ہو گیا کہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر طاقت کا استعمال درست نہیں۔ ۱۹۴۵ء
میں جب سیاسی بھارتی مقننہ کے لئے منتخب ہوا، تو اس نے اپنے دوست کی سرائی کا مطالبہ
کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا دوست جے پرکاش اتنا بے ضرر ہے کہ مکھی بھی نہیں مار سکتا۔
جے پرکاش نے اُسے جیل سے اسے لکھا، ”کیا تمہارا خیال ہے کہ صرف ان شریف آدمیوں کو جو مکھی
بھی نہیں مار سکتے، جیل سے رہا کرنا چاہیے۔؟“

۱۹۵۳ء تک جے پرکاش نے عوام میں اپنے مارکس ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اُس نے لکھنا
میں تین ہفتے کا سبوت رکھا۔ ”میں نے تین ہفتے سوچ بچار میں گزارے ہیں۔“ اُس نے ایک
دوست کو خط لکھا۔ ”میں نے مارکسزم کی فلسفیانہ بنیادوں کو مسترد کر دیا ہے۔ جذباتی مادیت
دغیرہ۔ کیونکہ ان میں مجھے اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ کوئی شخص کیوں اچھا ہو، یا کسی شخص
کو کیوں اچھا ہونا چاہیے۔؟“

بھودان پرگورام کے دوران سرودیا تحریک کے زیر اثر بالآخر جے پرکاش نے رجبہ
دل بھائے میں شمولیت کرتے ہوئے گاندھی جی کا راستہ اپنایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمیونسٹ
محکمہ کا سب سے بڑا نقاد بن گیا۔ ۱۹۵۴ء میں دس کے ہنگری پر اور ۱۹۵۹ء میں چین

کے تبت پر قبضے کی اس نے مخالفت کی۔ جے پرکاش نے کبھی وضاحت نہیں کی کہ ”مکمل انقلاب“ سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ تحریکوں یا وضاحتوں سے ہمیشہ گھبراتا ہے۔ لیکن اس کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھارت کے عوام کی سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی اقدار کو از سر نو مرتب کرنا چاہتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے ستائیس سال بعد بھی لوگ کچلے ہوئے ہیں۔ بھوک ہو رہی ہوئی قیمتیں اور بدعنوانیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ عوام ہر قسم کی مافضانی کاشکار ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ہندوستان میں عوام کو انقلاب کی طرف راغب کرتے ہوئے اُس نے کہا، ”تعلیمی ادارے بدعنوان ہو چکے ہیں۔ ہزاروں نوجوان تاریک مستقبل کا سامنا کرتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ غریب لوگوں کا کام دن بدن کم ہو رہا ہے۔ حیدرآبادی کے قانون وضع کئے جا رہے ہیں، مگر بگڑ گئے ہیں۔ ان کے تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

اس کے مخصوص نشانے میں ریاستی معینہ آتی ہے۔ بہار کی قانون ساز اسمبلی کو ایک کھلے خط میں اُس نے لکھا، ”دوستو! اگرچہ ۱۹۷۵ء کے عام انتخابات نے آپ کو عوام کا نمائندہ ثابت کیا۔ مگر آپ اپنا حق نمائندگی کھو چکے ہیں۔ اور اس کے مزید قابل نہیں کہ یہ نمائندگی کریں۔ ہمارے جمہوری اداروں اور ان کے طریقہ عمل میں اتنی خرابیاں ہیں کہ کسی بھی مسئلے کو آئینی طریقے سے حل کرنے کی دلیل لپے مٹی کھو چکی ہے۔“ اس کے خیال میں دیہاتی کونسلوں کو سیاسی وابستگی کی بجائے کردار کی پختگی کو مد نظر رکھ کر امیدوار منتخب کرنے چاہئیں۔ اور عوامی کمیٹیوں کو ایسے منتخب لوگوں پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔

اُس کے پروگرام میں گھراؤ، دھڑلہ اور بطور احتجاج برت شامل ہیں۔ اُس نے مختلف علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گروپ تشکیل دیئے ہیں تاکہ فیروں اور اعلیٰ افسروں، تاجروں اور برہمن زمینداروں کے بچوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ بدعنوانی ختم کرنے کے لئے اپنے اپنے گھر میں کم از کم بارہ گھنٹے کا برت رکھیں۔ تاکہ اُن کے بڑے بدعنوانی جیسی لعنت کو ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس فوج اور پولیس سے اپیل کی ہے کہ وہ عوام کو سفاکانہ طور پر قتل کرنا بند کر دیں، اور عوام سے اپیل

کی ہے کہ وہ لاٹھیاں کھٹنے، گولیاں کھانے، جیل جانے اور جائداد قرق کر دینے کی پروا نہ کریں۔ تاہم یہ سب کچھ تشدد کے بغیر ہونا چاہیے۔ آگ زلی یا ٹوٹ کھوٹ انقلاب نہیں لاتے۔ ہمیں گمانہ بھی جی کی طرف لوٹنا ہو گا۔

مینو میسانی، جے پی کا ایک قریبی آدمی کہتا ہے، ”اس آدمی کی دیانت بے مثال ہے۔“ شائد وہ بھارت میں بہترین جمہوریت کی آخری امید ہے۔ اگر اُس کی صحت نے اجازت دی (کیونکہ اس کی عمر ۷۷ سال ہے، اور وہ شوگر کے ساتھ مل کا رخص بھی ہے) تو وہ کامیاب ہو گا۔ تاریخی قوتیں اُس کے ساتھ ہیں۔“

نارائن کے لئے جو جذبہ مینو میسانی کا ہے، وہ رجنی پٹیل کا نہیں۔ جو اس وقت بمبئی میں کانگریس کمیٹی کا صدر ہے۔ اور گمانہ بھی کانگریس کی یونیورسٹی کے زمانے کا رفیق ہے۔ اُسے ہمارا شٹر کا بادشاہ گر بھی کہا جاتا ہے۔ پٹیل کسی زمانے میں پکا کمیونسٹ تھا۔ اور آزادی کی تحریک کے دوران حکومت برطانیہ نے اسے جیل میں لا ڈالا جس میں میسانی اور نارائن بھی تھے۔ ”میں نے اسی ٹرین میں سفر کیا، جس میں جے پی احمد آباد سے بمبئی لایا گیا تھا۔ اُس کا استقبال کرنے والے لوگ بہت خوش تھے، ہو کر تھے۔ یہ صرف صحافیوں کا کام ہے، جو بڑا چارٹر عا کر بیان کرتے ہیں۔ وہ (جے پی) اچھے باتیں کرتا رہا ہے، جیسے ماری بالدی، لینن اور مہاتما گاندھی کی رد میں اس کیلے میں جمع ہو گئی ہوں۔ جو اُس کے ذہن کا انتشار بڑھا گیا، اُس کی کوششیں ناکام نظر آتی گئیں۔“

پٹیل اور میسانی کے تاثرات بالکل الگ الگ ہیں۔ انتظامیہ سے ایک غیر ذمہ دار، انتشار پسند فرد کبھی ہے۔ جو جمہوریت کے غلام لوگوں کے جذبات بڑھاتا ہے۔ اُس کے محرف اُسے گمانہ بھی حکومت اور کمیونسٹوں کی تباہ کردہ جمہوریت کا محاذ سمجھتے ہیں۔

دلوں کی آراء ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہوئے خود ناشترم کا ثبوت ہیں۔ جے پرکاش کسی پارٹی کا سربراہ نہیں، اور نہ ہی وہ اپنی تحریک کو کسی پارٹی کے زیر اثر گردانتا ہے۔ اندرا گمانہ بھی کے توسط عہد حکومت کو ختم کرنے کے لئے حزب اختلاف، انتہائی دایاں باز

جن سنگھ، آرا ایس ایس، اور دوسری طرف آنتھ مارگ، سوشلسٹ، انتہا پسند مادکسٹ اور مارکسٹ لیننٹ گروپ اس کی سینک میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے بہت سے ہمدردوں میں ایسے سیاستدان بھی ہیں، جن کو کمیونسٹ بدعنوان کہتے ہیں۔ ایسے منحنکار بھی ہیں، جو پارلیمنٹ کے آزاد رکن ہیں۔ جیسے رام ناتھ گوانیکا، جو ایکسپریس کا مالک ہے، اور جو جے پی کا ہفت روزہ ایوری منیز ویلی نکالتا ہے۔

اس وقت حکومت اور ماسکوناز کمیونسٹ تمام حزب اختلاف سے زیادہ مضبوط ہیں۔ لہذا انہوں نے کئی ضمنی انتخابات میں سابقہ امیدواروں کو شکست دے کر کانگریس کو مضبوط بنالیا ہے۔ جے پی پرکاش بہار میں نہایت ہی مضبوط امیدوار ہے۔ بہار اور ملحقہ مشرقی علاقوں مثلاً اتر پردیش میں اس کے پیروکاروں کی تعداد نوے فیصد کے قریب ہے۔ ملک کے باقی علاقوں میں یہ سطح حکومت کے خلاف لوگوں کی تحریک پر مبنی ہے۔ طالب علموں کی بہت بڑی تعداد اس کی "تعلیم چھوڑ دو" کی پالیسی پر عمل نہ کرنے کے باوجود اس کی مددگار ہے۔ کانگریس یا کمیونسٹوں کے زیر اثر ٹریڈ یونینوں نے اس کی ہڑتال کرنے کی اپیلوں کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے جلسوں میں جن میں سب سے بڑا الجھی میں ہوا، زیادہ تعداد میں لوگ انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ حالانکہ ساری آبادی کا تقریباً تین فیصد انگریزی بولتا ہے۔ مینو نیائی کا کہنا ہے کہ یہ ایک درمیانے درجے کا انقلاب ہے، جس کی رہنمائی جے پی کر رہا ہے، اور وہ خوش ہے کہ اس میں نوجوان شامل نہیں ہیں۔ تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جے پی کی تحریک صرف اس کی شخصیت کی وجہ سے کامیاب ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت وہ رہبان استعمال کر رہا ہے، جو ملک کا اینٹیلکچرل طبقہ بھی سمجھ رہا ہے، اور محفلوں مجلس میں رہنے والا بد عمل آدمی بھی۔ کانگریس کے ایک پارلیمنٹ ممبر کا کہنا درست ہے، "جے پی کا مکمل انقلاب" ایک مکمل شکست ہوگی۔

اگرچہ اس چُر چُر ٹرین کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے کہ اس میں بہت سے لوگ، مساکانہ بھی مخالفت کی بنا پر شامل ہیں۔ تاہم جے پی کی تحریک کی قوت کو نظر انداز نہیں

کیا جاسکتا۔ مجاہد میں انتخابات امیدواروں کی شخصیت اور نعروں کی بنا پر جیتے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۱-۷۲ کے انتخابات میں مسز گاندھی کی فتح بنگلہ دیش کا فتح ہونے کی بنا پر تھی۔ انہوں نے ملک کو ایک نعرہ دیا۔ "غریبی بٹاؤ" اور پھر سارا ملک اس سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ اور عوام نے اسے "اندیا لہر" کا نام دیا۔ اس وقت سے غریبی ختم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بدعنوانی، سمنگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری بھی پروان چڑھی ہے۔ اندیا گاندھی کا بت پاش پاش ہو گیا ہے۔

دوسری جانب جے پی کی صورت میں مہاتما گاندھی کی تجسیم پڑی ہے۔ اس نے بھی ایک نعرہ دیا ہے "بھرا شٹا چار" شٹا یعنی بدعنوانی ختم کر دو۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ کانگریس کو ہٹانے کے لئے جے پی لہر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگلے سال جب عام انتخابات ہوں گے، تو اس ٹیڈھ کی بڑی توقع ہے۔

جے پی نے کئی مرتبہ یقین دہانی کرائی ہے کہ اس کی تحریک گاندھی کی طرح عدم تشدد پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں کئی مواقع تشدد کے آئے ہیں۔ گجرات میں ذخیرہ اندوزوں اور، منافع خوروں کے درمیان تصادم میں صوبائی اسمبلی کے کئی ارکان کو مارا پیٹا گیا، اور بالآخر اسمبلی کو توڑنا پڑا۔ جے پی نے گجرات کی مثال دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ بہار کی قانون ساز اسمبلی بھی معزول کی جائے۔

جگموجن رام جو گذشتہ ۲۵ سال سے بہار سے منتخب ہو رہے ہیں، جے پی کی قوت سے آگاہ ہیں، اور کمیونسٹوں پر جے پی کی طرح تنقید کرتے ہیں۔ بہار اور اتر پردیش کے کئی کانگریس ممبران نے جے پی کے گاندھی جیسے کردار کی تعریف کی ہے۔ بدعنوانی اور جبر کے خلاف جہاد میں اس کا ساتھ دیا ہے۔ اور مسز گاندھی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ جے پی پرکاش کے ساتھ مذاکرات کریں۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگلے انتخاب میں بہت سے لوگ کامیابی حاصل کرنے کی خاطر جے پی کے راہ ہو جائیں۔ اب یہ کوئی از نہیں رہا کہ جگموجن رام اور بشونت راؤ جو ان مسز گاندھی کو ہٹانے

کے خواہشمند ہیں۔

سینئر گاندھی اس دھمکی سے بھی آگاہ ہیں، جو بے پراکاش کی صورت میں اُن کے لئے موجود ہے۔ انہوں نے مجھے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا، کبجے پر کاش کی تحریک میں احتجاج کا عنصر نمایاں ہے۔ اور اس ملک میں بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن پر احتجاج کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ بہت سی باتیں غلط ہیں۔ انہوں نے کہا: تاہم بے پراکاش کی تحریک یا منشور میں ہمیں اپنے مسائل کا کوئی واضح حل نظر نہیں آتا۔ اس میں شامل بہت سے لوگوں کی رائے ہے، کہ ایک منتخب اکثریت کسی کام کی نہیں۔ اور اگر لوگ اکثریت کو منتخب کرتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے، کہ لوگ غلط ہیں یہی وجہ ہے، کہ میں اسے فاشسٹ تحریک کہتی ہوں۔

حیران کن تو بات یہ ہے، کہ بے پی کی تحریک کے ہی خواہ ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں عوام بدعنوان کہتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں، کہ پوری تحریک ہی بدعنوان ہے۔ بلکہ میری توقع تو یہ ہے، جو لوگ بدعنوانی کے خلاف ہیں، آئیں، اس تحریک کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔ اگر آپ بدعنوانی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، تو پھر آپ کو بدعنوان افراد کو باہر نکالنا ہوگا۔ میں نے سینئر گاندھی سے پوچھا، کہ حکومت بے پی کی تحریک کو روکنے میں ناکام کیوں رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا، کہ حکومت نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم رلائی جگڑا نہیں چاہتے۔ ہم اسے گرفتار کر سکتے تھے۔

سینئر گاندھی انتہائی اصلاحات اور انتخابات کے دوران سر ملنے کے مسائل کے خلاف بات تو کرتی ہیں، لیکن بے پی کی یہ بات نہیں مانتی، کہ عوام کے اصرار پر قانون ساز ادارے کا اعداد قرار دے دیئے جائیں۔

بے پی کے بدگو (اور ان کی تعداد کافی ہے) کہتے ہیں، کہ اس کے خیالات میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ ایک مسلم عالم اور مہاراشٹر حکومت میں سینئر وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا کا خیال ہے، کہ بے پی کی ساری زندگی تضادات میں گزری ہے۔ امریکہ میں مارکسٹ ہونا، بھارت میں مارکسزم کے خلاف ہوجانا، ہندو کامنرف اور پھر اینٹی ہندو، لہجہ دان کی تحریک میں شامل

ہونا، اور پھر تعلق ہونا۔ گذشتہ تیس سالوں میں بے پی صرف ایک چیز پر مستقل مزاج رہا ہے،

اور وہ ہے اپنی غلطیوں کا اعتراف۔ آج بھی وہ ایسا ہی ہے۔ وہ مکمل انقلاب کی بات کرتا ہے۔ اور وہ ہے اپنی غلطیوں کا اعتراف۔ لیکن ان کے خلاف بھی ہے۔ وہ فوجی ڈکٹیٹروں مثلاً پاکستان مارٹر اور لینن کی تعریف کرتا ہے۔ وہ حکمران جماعت کی ماسکو نواز کمیونسٹوں کے ساتھ آمیزش کے صدر ایوب کی تعریف بھی کرتا ہے۔ وہ حکمران جماعت کی ماسکو نواز کمیونسٹوں کے ساتھ آمیزش پر تنقید کرتا ہے۔ لیکن پکننگ نواز نکل باڈیوں، سوشلسٹوں، جن سنگھیوں جی کہ آئندہ مارگ کی مدد بھی حاصل کرتا ہے۔ اس کا مکمل انقلاب کوئی معاشی لائحہ عمل نہیں بناتا۔ اس کی تحریک کانگریس کے خلاف منتشر جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے پاس بھارت کے معاشی مسائل کا کوئی حل نہیں۔ وہ جمہوریت بچاؤ کانفرنس لگاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہتا ہے، کہ سیاسی جماعتیں

ختم ہونی چاہئیں۔ بے پراکاش کے لئے بہترین خطاب مسٹر کنفیوژن ہو سکتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے، کہ ہم اپنی تمام تر توجہ مکمل انقلاب پر مرکوز کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں مسائل کے بارے میں واضح ہونا چاہیئے۔ ہمیں بے پی لازماً اس کے خلاف ہو کر سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ ہم اس کی تحریک کی حمایت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں ذاتی تعصب سے گریز کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی بغیر کسی وجہ کے حکمران جماعت کے خلاف ہونا چاہیئے، کیونکہ ہم بھارت کے مستقبل اور جمہوریت کے خواہاں ہیں۔

بے پی نے کانگریس اور انتظامیہ کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں، اُن میں دنن ہے۔ بدعنوانیاں تو ضرور موجود ہیں، اور حکومت ملتا نہیں ختم کرنے کے لئے کئی آرڈی ننس بھی جاری کیئے ہیں۔ انتخابات کے دوران پارلیمنٹری یونٹوں نے عوامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کی ہے۔ اور کانگریس پارٹی نے انتخابات جیتنے کے لئے کالا دھن استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ کام صرف کانگریس نے ہی نہیں کئے، دوسری پارٹیوں نے بھی اس سے اجتناب نہیں کیا۔ حکومت سے زیادہ حزب سدھ نے تارنی اور جمہوری اداروں کو تباہ کیا ہے۔ یہ صرف اور صرف ان لوگوں کی مہربانی ہے، کہ آج اہم جنسی قائم ہے۔ ان کے گھیراؤ، جلاؤ اور دھرنے روکی یا لیسوں

نے حکومت کو مجبور کیا ہے، کہ وہ جمہوری طریقے کی بجائے آرڈی نینس کا سہارا لے۔
 کانگریس اور حکومت دونوں جمہوریت کا گلا گھونٹنے کی ذمہ داریاں کیرالامیں اٹھاتی
 کیونست حکومت کا اختتام اور گجرات میں صدر راج کا لٹا ذہبت بڑی حاکمیتیں تھیں۔
 حکومت کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ انتخابات آزادانہ ماحول میں ہوں گے۔ کسی کی جیت سرما
 کی طاقت پر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حزب اختلاف بشمول جے پی پر ہوگی۔
 اگر یہ شخص صحیح طریقے سے منتخب ہو کر آتا ہے، تو پھر اسے اپنے دراصل انجام دینے
 میں رکاوٹ بنیں ڈالنی چاہیئے۔ اُسے جبراً ہٹانا نہیں چاہیئے، جب تک کہ اس کے دوط
 دہندگان اُسے خود نہ ہٹائیں۔ یہی جمہوریت کی بنیاد ہے، اور جے پی کی تحریک اس کی
 بیج کی میں کوشاں ہے۔

جادو بھری آواز۔ رونا لیلیٰ

ایک رات مجھے اسے سننے کا اتفاق ہوا آج بھی نصف شب کے قریب اس کے
 نغمے میرے کانوں میں گونجتے ہیں نغموں کی شاعری البتہ صحیح طور پر یاد نہیں ایک توفیق
 احمد فیض کی شاعری تھی جس میں بادلوں اور شراب کی خواہش تھی اور پھر ہر خواہش سے
 بے نیازی دوسرے ایک بنگلہ لوک گیت تھا جس میں عاشق قسین کھا کر محبوبہ سے محبت
 کا اظہار کر رہا تھا۔ آخری گیت ایک ملتان گیت تھا جس کا ایک لفظ میری سمجھ میں نہ آیا لیکن
 اس گیت نے سب سے زیادہ لطف دیا۔ کو میسر اجیت سیٹھی درست کہتا ہے کہ رونا کو کالوں
 کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے بھی سنا چاہیئے۔ اس کی خوبصورت آواز ادا اس چہرہ اور
 مترنم ادائیگی نے میری فیند تباہ کر دی۔ وہ کون پاچی تھا جس نے اس کی مسکراہٹیں ادا
 کر دی تھیں۔ یہ میں ہی تھا جیسا کہ ڈاؤسن نے کہا۔ پرانے جذبوں کا اسیر۔ آج کی
 رات اس خوبصورت شرابی مترنم آواز اور بنگلہ دلش کی حسینہ کے نام تھی۔
 پردہ اٹھنے سے پہلے مجھے چند لمحے رونا لیلیٰ کی والدہ بیگم سید امداد علی سے گفتگو کے
 لیے مل گئے ان پانچ نمٹوں میں اپنی بیٹی کے مستقبل سے زیادہ وہ اپنے خاندان کی عزت
 توقیر کے متعلق گفتگو کرتی رہی (میاں امداد چٹا گانگ میں کسم آفیسر ہیں رونا۔ دراصل
 رونا لیلیٰ ۶۶ سال قبل سلہٹ میں پیدا ہوئی گویا پیدائشی طور پر وہ ہندوستانی ہے
 اس کے باپ نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور پھر یہ خاندان ملتان جا کر آباد ہوا تمام
 زبانیں رونا لیلیٰ نے موسیقی کے ذریعے سیکھیں وہ ایک رقصہ بننا جانتی تھی لیکن اُن
 پاکستان میوزک کونسلٹ میں اس نے پہلا العام حاصل کیا تو پھر اس کی توجہ موسیقی کی طرف
 ہو گئی۔ اس نے استاد کا دھیر پالی سے تربیت حاصل کی موسیقی کے مقابلوں سے فلموں

تک اور پھر فلموں سے سٹیج شو تک اس نے بنگالی، پنجابی، ملتان، پشتو، سندھی، اردو اور ہندی کے تقریباً تین ہزار نعماں ریکارڈ کروائے ہیں، اب وہ لٹا، آشا اور کشور کی طرح اعلیٰ ترین معاوضہ وصول کرتی ہے۔ بمبئی کے ایک پروگرام میں اسے چودہ ہزار روپے پیش کئے گئے، سامعین کی اس حوصلہ افزائی سے وہ اس معاوضے کو دوگنا بھی کر سکتی ہے۔ سٹیج پر اس جیسی پذیرائی ہمارے اور کسی گلوکار کے نصیب میں نہیں، اور اس کے ہاتھ میں دوسرے گلوکاروں کی مانند کبھی کوئی نوٹ بک نہیں دیکھی گئی۔

لٹا شیکر اور آشا بھوسلے کے ساتھ ساتھ اسے بھی شمار کیا جاتا ہے یہ تینوں اپنے اپنے لحاظ سے عظیم ہیں۔ لٹا اور آشا کے ہر تار دور دراز تک موجود ہیں اور وہ بتم کلاسیکل موسیقی میں ابھی تک سرفہرست ہیں لیکن رونا کی گہری آواز اور اداسی کا انداز اسے آئندہ دس سالوں میں فلمی گلوکاری میں سرفہرست رکھے گا۔

بنگلہ دیش اور پاکستان رونا سیلی کے فن کے لیے بہت چھوٹے علاقے ہیں، اس کے مستقبل کا ملک بھارت ہے اور صرف بھارت۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھارت میں کسی پاکستانی ہائی کشن نے کہا تھا کہ ہم سے کشمیر لے لو اور ہمیں لٹا دے دو میں بنگلہ دیش سے کہتا ہوں کہ فرخا بیراج کا سارا پانی لے لو اور رونا سیلی ہمیں دے دو

ہیرا ملے مکمل

رات کے کھانے کی دعوت سارے سات بجے ہے جہاں خصوصی کی عمر ۱۳ سال ہے اور وہ زیادہ دیر تک جاگ نہیں سکتا۔ وہ ایک ٹکھنڈ دیر سے آیا ہے شاید اس لیے کہ وہ شراب نہیں پیتا اور دوسروں کو موقع دیا ہے کہ وہ کھانے سے پہلے کچھ پی پی لیں۔ وہ گہرے رنگ کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس ہے اور اس کے ہاتھ میں بڑی سمارٹ سی بیک کی جھڑی ہے جس پر ایک سلور کی پلیٹ لگی ہے جس پر ان ان لوگوں کے نام کندہ ہیں جنہوں نے اسے بہ تحفہ دیا ہے۔ اس نے پوچھت کی ہے اور ہم سب کے متعلق جانتا ہے۔

”اوہو۔ مسٹر پاکی والا۔ آئین پر آپ کی بحث کبھی جا رہی ہے۔“

”مسٹر پستانی۔ منسٹر شپ کے بارے میں آپ کا فیصلہ میں نے پڑھا تھا۔“

”آئندہ۔ بتم بڑے ناول لکھتے ہو۔ لیکن افسوس ہمیں نہیں دیتے۔“

”مکمل۔ ہم وکی اور لوگوں جانتے ہوں گے۔ وہ بہت اچھے اور دلچسپ ٹونسٹ تھے۔“

وہ ایک آرام دہ کرسی میں دفنس جاتا ہے اور اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لیتا ہے۔ وہ بالکل اپنے کارٹون کے مطابق نظر آنے لگتا ہے جو لوگوں نے اس کے متعلق بناتے ہیں اس کی آنکھیں جینیوں کی مانند ہیں صرف بائیں سمتے ہوئے کھلی نظر آتی ہیں باقی اوقات میں وہ سویا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی جوں جوں بہت

اور صرف فوری اپر کلاس کی طرح ہے۔ کیا ہا، جیسا ہا، سکاچ، سوڈا، ملا کر

نکریہ۔ بس اس سے زیادہ ہیں۔

جہاں اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ ایرضی یا اندرا گاندھی کے بارے میں کچھ

نہیں کہے گا۔ یہ مناسب نہیں۔ چرچل نے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی سیاسی بیان نہیں دیا اور چرچل ایک دلچسپ وزیر اعظم تھا۔ اس لیے ہم دوسرے مومنومات پر گفتگو کرتے ہیں آپ کے زمانے میں مشہور مقرر کون کون تھے۔ وہ بہت کم جواب دیتا ہے۔ وہ اپنا کوٹا ختم کر چکا ہے اور ۹ بجے دلے ہیں اس لیے ہم ڈر کی میز کی طرف چل رہے ہیں۔ وہ میرے سامنے والی میز پر بیٹھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں پانکی وال سے اس کی گفتگو نہیں سن پاتا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہر پانچ چھ منٹ کے بعد وہ اپنی میزبان مسٹر پیٹرنز کی طرف مڑ کر اطمینان کر لیتا ہے کہ وہ قریب ہی باقی اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ سوپ کے دوران شیرے کے ٹکڑے بھی لیتا ہے کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں کافی یا شراب کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں وہ تھوڑی سی برانڈی لیتا ہے۔ اور ہوانا نامی سگار سگایا کرتا ہے۔

”تم مجھ سے اچھے مقرروں کی بابت پوچھ رہے تھے۔“ وہ گفتگو کا ٹوٹا سدا جوڑتا ہے۔ ”ہاں تو چرچل۔ اس کی تمام تقاریر مجھے اندہ ہر ہیں۔ اینورن ہولن بھی اچھا تھا۔ رنٹ بوجن بھی کام کی باتیں کرتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی لائڈ جارج اور اس کو تھکا کا ہم بد نہیں تھا۔ جب میں نے پارلیمنٹ میں پہلی تقریر کی تو میرا خیال تھا کہ میں نے بڑا کام دکھایا ہے۔ لائڈ جارج نے مجھے برا بھیجا اور کہا کہ تمہاری تقریر تو اچھی تھی لیکن عوام میں سے کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لے گا تم نے ایس نکات پیش کیے۔ اچھا ہوتا اگر تم ایک ہی نقطہ بیان کرتے۔ ہر لمحہ کو دوسرے ممبر سے ہی توقع ہوتی ہے۔ دو وزیر کا مینہ کی طرف سے اور تین وزیر اعظم کی طرف سے اور بس۔“

وہ اپنے تبصرے پر خوش نظر آتا ہے اور پھر یوں محسوس ہوتا ہے گویا نیند کی دادی میں جا چکا ہے جب ساتی اس کا گلاس لینے آتا ہے تو وہ مزید شراب کے لیے گلاس آگے کر دیتا ہے۔ ہم بند دستانیوں پر آتے ہیں جو اس سے مل چکے ہیں ”جناح اسی گرم مکان میں اسی کمرے میں اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت

قابلِ قرار تھا۔ اور وہ دراصل ایک۔ تمہیں شاید نام یاد ہو۔ ڈیلیٹی ہاں۔ بھولا بھائی وہ بھی بہت اچھا تھا۔“

وائس چانسلر صاحب ایک اور نام سری نواس شاستری۔ بھارت کا بہترین مقرر بادولنے ہیں مسٹر میکس انکلیس اٹھاتا ہے اور جواب دیتا ہے۔

”ہاں۔ اور مولد موزے۔ میں بادولاتا ہوں۔ ہاں۔ ہوشیار لڑکا تھا۔ لیکن وہ شہریت حاصل کرنے میں جلد بازی کرتا تھا۔ پارٹی لیڈر بننے سے پہلے میں نے اس سال آخری پنجوں پر گذارے۔ سیاست میں ممبر بہت ضروری ہے۔“

انوک پاول نے کوئی یاد دلاتا ہے۔ لیکن مسٹر میکس اپنے خانی گلاس سے لے کر نا منظور کر دیتا ہے۔ گلاس دوبارہ بھرا جا چکا ہے۔

اب رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ فریڈی ہمتہ اندر آتا ہے اور شوٹ جھوٹا ہے۔ ”سر آپ کب تک بیٹھیں گے۔“

”میں۔ دو بجے سے پہلے تک۔“

ہم ناخوش نظریں ملاتے ہیں۔ ”پھر تو آپ سب دیر سے اٹھیں گے۔“

”نہیں میں سات بجے اٹھ جاتا ہوں۔“ مجھے زیادہ نیند کی عادت نہیں۔ پس ہم برطانیہ کی سیاست کے لیے اس کی محبت اور میکس کے گھر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ آدھی رات ہونے والی ہے۔ پھر برطانیہ کا بلج وزیر اعظم نشوونما کا اظہار کرتا ہے۔

”آپ میں سے بہت سے لوگ جانا چاہتے ہوں گے۔“

جہان بادل خواستہ اٹھتے ہیں آپ سے مل کر نہایت ہی خوشی ظاہر ہوئی سر۔

جہان کہتے ہیں۔

سر نہیں۔ وزیر اعظم کے لیے خطاب حاصل کرنا بہتر نہیں ہوتا معلوم نہیں

چرچل نے اسے کیسے قبول کیا اور ایٹی لیٹی نے بھی۔

اس سے پہلے وہ خطاب قبول کرنے یا نہ کرنے کی بحث چھڑاتا ہم اپنے اپنے گھر کو چلے

آندری مال راکس - دھماکہ خیز قوت

ایک عظیم ادبی شخصیت اور ہمہ وقت انقلابی — پیرس میں حال ہی میں موت سے دوچار ہونے والا آندری فرانس کے ادب اور سیاست پر چھایا ہوا تھا۔ وہ صدر ڈیگال کا نظر پر سارا اور پوری دنیا میں اس کا مخالفت تھا۔ اس نے چین کے انقلابی کمیونسٹوں کا ساتھ بنھایا۔ اسپین کی سول واریں حصہ لیا۔ جنگ عظیم دوم میں فرانسیسی مزاحمت میں شمولیت کی، اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں مدد کی۔

بین الاقوامی واقفیت عامہ کی بنا پر ۱۹۷۲ء میں اسے ہنر وادارڈ سے نوازہ گیا۔ ۱۹۷۴ء میں جب یہ ایوارڈ وصول کرنے بھارت آیا، تو میں نے اس کا انٹرویو لیا۔

ایک ایرکس نے اپنی کتاب گانگہ کی سچائیاں میں کہیں لکھا ہے، کہ قریب سے کہیں زیادہ اہم وجہیں ہیں — عمل اور خاموشی — آندری تحریر اور عمل میں یقین رکھتا ہے، لیکن خاموش نہیں رہ سکتا۔ انسان اپنے عمل سے جانا جاتا ہے، وہ کہتا۔ اس کے ہیر و باعمل لوگ تھے، ساڈھے ڈیگال، لارنس آف عربیہ — اس نے نہ صرف ان لوگوں کے متعلق قریب کیا، بلکہ اپنی زندگی کے پچھتر سال عملی جدوجہد میں گزارے، جہاں وہ وقت سے کٹی بار بال بال بچا۔ اگرچہ اس نے اپنے بارے میں سچی بات نہیں بتائی، تاہم وہ ہر جگہ معقول تھا۔

مال راکس کے خاندان کا تعلق فلینڈر سے تھا۔ اس کا باپ شراب اور کھلی کا سوداگر تھا۔ ۱۹۰۱ء میں آندری کی پیدائش ہوئی۔ آندری کے باپ نے دودھارے کھلاڑے سے اپنی زندگی ختم کر لی تھی۔ اس کی پیدائش کے چار سال بعد اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی، اور وہ اپنی ماں

کے ساتھ رہنے لگا، جو مہتری کی دوکان کرتی تھی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اس میں سے دو بیٹے ہوئے، اور پھر اس نے خودکشی کر لی۔ آندری کہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ تمام ادیب اپنے بچپن سے محبت کرتے ہیں، مگر میں لغت کرتا ہوں۔

آندری کی تعلیم کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ اور جو کچھ اس نے خود قریب کیا ہے، وہ بہت معلوم نہیں ہے۔ تاہم ۱۹۲۰ء میں وہ دریائے سین کے کنارے کتہاں ہی آکر رہا تھا۔ رہا نہ رہا اور بہت روزوں میں آرٹ پر محسوس کا کرتا تھا۔ اس نے ایک ماہر یہودی درخیزہ کلاہ کو اپنے سے شادی کی۔ جس نے طلاق سے پہلے شوہر کی سوانح حیات لکھی۔

آندری نے اپنی بیوی کی دوست شاگ ایکسچ میں لگادی۔ کوئی روزگار حاصل کرنے نہ جاسکے وہ قہیم فنون اور بشریات کا مطالعہ کرتا رہا۔ جب کبھی اس کی بیوی پر کسی شکایت کرتی، تو وہ کہتا تھا وہ فحاشی اور چھینچھاننا تمہاری نظرت بن چکا ہے۔

۱۹۲۳ء میں آندری نے پیرس کے ایک اعلیٰ ادارے سے قدیم زبانوں کا ایک کورس کیا۔ اور اپنی بیوی اور دوست کے ساتھ کبھو ڈیا چلا گیا۔ نومبر میں اپنے قیام کے دوران دونوں دوست انکو روٹ کے ساحل کے قریب ایک علاقے میں گیا، اور ایک لافارت بدھ مندر لکھا۔ اسی تیکہ لیا گیا۔ مال راکس کو تین سال قید ہوئی۔ اپیل کے نتیجے میں یہ دو سال میں تبدیل ہو گئی۔ اور پھر اس کی بیوی اور دوسرے دانشوروں کی فرس من قریب کے جہم میں ختم ہو گئی۔ محسن احسان آندری فرانس واپس آیا۔ مگر اپنی بیوی کے لئے تحفے کے طور پر حشیش لایا۔

ایک سال بعد مال راکس بھارت کے چھپی علاقے میں واپس آیا، تاکہ حکومت کے ساتھ اپنے جھگڑے ختم کرسکے۔ اس نے آزادی کی جدوجہد کا معاون رسالہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا نام ہنر وادارڈ تھا۔ جرنل تھا۔ انتظامیہ نے اس پر جبر دمانا چاہا۔ مال راکس نے جواباً ایک کتاب لکھ دی جو مغرب کی قریبوں میں اس نے نوآبادیاتی نظام کے خفیہ اذیت دینے، اور قدیم ثقافت کی تخریب کرنے کے بارے میں اس کے دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں اس نے اپنا پہلا ناول "ناخوش" مکمل کیا۔ اس میں ۱۹۲۵ء کے فوجی انقلاب

مارا کس کے مطابق فاشنزم کا مطلب شیطان کی والسی تھا۔ وہ خفیہ طور پر جنگ میں شامل ہوا۔ جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ لیکن جیل سے بھاگ کر فرانس کے جنوبی علاقے میں اپنی بیوی سے جاملے۔ اُس کا ناول "دی والٹ ٹریز آف ایٹلن برگ"، فاتح جرمنوں کے ذہنی انقلاب کے بارے میں ہے۔ یہ تبدیلی جرمنوں میں اُس وقت آئی، جب وہ گیس کو بطور ہتھیار استعمال کر چکے تھے۔ جب فرانس کو شکست ہوئی، تو ماراکس ماکوٹس کی مزاحمتی تحریک میں شامل ہو گیا۔ جرمنوں کے ساتھ ایک مطالبے میں اس کا ڈرائیور مارا گیا، اور وہ خود زخمی ہو گیا سمیت قید ہو گیا، اور اسے موت کی سزا سنائی گئی۔ اُسے ایک فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، جس نے اس پر خالی فائر کیے۔ اپنے اس تجربے کو اس نے اپنی کتاب "اینٹی میوریز" میں بیان کیا ہے۔

جب جرمن چلے گئے، تو وہ جیل سے رہا ہوا، اور باہر آتے ہی اُس نے مارکوٹس کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ آندری ماراکس اپنے دوست بھائیوں کو کھوکھرا "آزادی کا راس" اور "کروشنے ڈی گیس" حاصل کر چکا تھا۔ ایک شدید المیہ ابھی باقی تھی۔ ۱۹۴۴ء میں دو بیٹوں کو جہنم دینے والی جوئے کلاٹس ایک ریل حادثے میں ہلاک ہو گئی۔

جنگ عظیم کے اختتام پر ماراکس کا انقلابی جوش و جذبہ سرد ہو گیا۔ اُس نے جنرل ڈیگال کی صوبائی حکومت میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی۔ بعد میں اُس نے وضاحت کی، کہ اُس کے جوانی کے نظریات اور موجودہ نظریات میں بڑا فرق ہے۔ "میں نے ہر وقت یہ سوچا کہ فرانس سے بدل لیلیے" اُس نے کہا۔ کو مسیاریوں کی بھلے کار میاگیوں کو ترجیح دی۔ ڈی سال کی صورت میں اُسے جنگ آزادی کے ہیرو اور نوآبادیات کے خلاف ایک شخص کی سی شخصیت ملی۔

اس کے نزدیک ڈیگال ازم کا مطلب فرانس کی خدمت تھا۔ جنرل ڈیگال نے بھی ماراکس کو اپنا دایاں ہاتھ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا۔ ڈیگال کے بقول ماراکس کی موجودگی اُسے ہر شکل سے بچاتی تھی۔

کا ذکر تھا۔ وہ گیلی مارڈ کے باعزت گروہ میں شمار ہونے لگا، اور آندی گائیڈ کا قریبی دوست بن گیا۔ کام کے دوران اُس نے ایران، افغانستان، بھارت، ملائیشیا اور چین کا بھی دورہ کیا۔ جیس میں اُس کے ناول "انسان کی قسمت"، کو فرانس کے نوبل انعام کے برابر پیکس کون کورٹ انعام ملا۔ ناول کے کرداروں میں اس کی بیوی کلارا بھی ہے۔ جس نے اپنی بے حیائی کا بھی اعتراف کیا، اور ۱۹۳۶ء میں طلاق حاصل کی۔

انعام کی رقم اور کتابوں کی رائٹی نے آندی کو اس قابل بنایا، کہ وہ ملکِ عرب جا کر ملکِ شیا کا شہر تلاش کرے۔ اُس نے اپنی دریافتوں کے متعلق بڑے پُر جوش خط لکھے، جن سے اُس کی تصوراتی دنیا کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۹۳۰ء کے دہائی کے میں ماراکس کی صلاحیتیں یورپ میں بڑھتے ہوئے فاشنزم کے خلاف جمع ہو گئیں۔ ری ستاگ میں آگس کی واردات میں دستری کو بچانے کے لیے آندی اور گائیڈ نے مل کر کام کیا۔ اس کا چوتھا ناول "ڈیز آف ورثہ"، نازیوں کے اذیتنا کیمیوں کے بارے میں ہے۔ پھر وہ سپین چلا گیا، جہاں خانہ جنگی ٹھوٹ چکی تھی۔ اُس نے فرانکو فاشسٹوں کے خلاف سپین کی ایئر فورس کو منظم کیا۔ وہاں اُس نے اپنے ہم نسلوں ہینگ وے، ڈان پاسوس، نرود اور ایلیا اہرن برگ سے ملاقاتیں کیں۔ اہرن برگ نے ماراکس کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے، کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی جذبے کے زیر اثر ہوتا ہے۔

ماراکس نے سپینی زبان میں پیٹھ کہاںیاں تحریر کیں۔ پھر اس نے اس تجربے کو ایک فلم کی صورت میں ڈھالا۔ اُس نے جو فلم بنائی، اُس کا نام "لا اسپائر" یعنی "امید" تھا۔ اُس کا خیال تھا، کہ سپین کا انقلاب امید کا ہی اظہار تھا۔ بیٹی کی پیدائش کے تین سال بعد اس کی بیٹی بیوی کلارا نے اُسے طلاق دے دی، تو ماراکس نے جوئے کلاٹس نامی ایک پھر سے شادی کر لی۔ دونوں فرما نبرد ار سپین کے کار کی خاطر ریاست ہائے متحدہ امریکہ روانہ ہوئے۔ فرانکو جیت گیا۔ اور دوسری جنگ عظیم نے ناگزیر حثیت اختیار کر لی۔

ڈیگال کی ریٹائرمنٹ کے دوران مالراکس نے "وائس اور سائی لینس"، ایبجی میوزک اور میٹا مارفس آف میڈیٹیشن کیس۔ ۱۹۵۸ء کے موسم بہار میں جب ڈیگال پھر سربراہ بن کر آیا، تو مالراکس اس کی حکومت میں ثقافتی امور کا وزیر بن گیا۔ جنرل اور اس کے ساتھی دانشور نے الجزائر سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کرنے کی تدابیر کیں۔ فرانسیسی فاشسٹوں کے ہاتھوں مالراکس پر کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ لیکن وہ محفوظ رہا۔

اپنے ملک کی ثقافتی حالت کو اندری مالراکس سے زیادہ بہتر کسی ذریعہ ثقافت نے نہیں بنایا۔ اس نے ہیرس کے چہرے سے میل اور کالک اٹار کر اسے ہیرے کی طرح چمکا دیا۔ اس نے فوجی یونیفرم کی تنظیم نو کی، اور دنیا بھر میں خیر سگالی دوروں پر گیا۔ نہ گیارہ سال تک وزیر رہا۔ موت کتنے کی طرح مالراکس کے قدم سونگھ رہی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں اس کے دروں بیٹے اذیت ناک موت کا شکار ہوئے۔ اس کی دوسری شادی جو اس نے اپنے سوتیلے بھائی کی بیوہ سے کی تھی، علمی و ادبی پر ختم ہوئی۔ دل بہلانے کی خاطر اس نے مصر، بھارت اور چین کا بھری سفر کیا۔ مالراکس کے اندر سلگتی آگ، بیماری، طویل عمری، شکستہ رشتوں اور ذاتی المیوں کے باوجود کم نہ ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں سبب (عہد عتیق کا یونانی نام ان لوگوں کے لئے جو قدیم مہند نامہ کو مانتے ہیں) مالراکس نے پاکستانی فوجوں کے تشدد کی مذمت کی، اور بنگلہ دیش کے آزادی کے جیالوں کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔

میری مالراکس سے ۱۹۷۲ء میں کلکتہ میں ملاقات ہوئی، جب وہ نہرو ایوارڈ حاصل کرنے آیا۔ یہ انٹرویو عبثی کے گزرتا رہا علی یاد جنگ اور فرانسیسی سفیر مسٹر جن ڈیٹیل گرنس کی کوششوں سے طے ہوا۔ میں اس سے ملنے میں بچکا ہوا تھا۔ ایک تو میں نے مالراکس کا مطالعہ بہت کم کیا تھا اور دوسرے مجھے علم تھا کہ تمام فرانسیسی دانشوروں کی طرح وہ بھی فرانسیسی میں ہی گفتگو کرتا ہے۔

موت کے ساتھ اس کے بے شمار تصادم میرے ذہن میں تھے۔ اس کی یہودی بیوی کی

بے وفائی، اور بعض عورتوں کے ساتھ اس کے مراسم (یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ۱۹۷۲ء میں اس نے ایک مالدار وارث سے شادی کی تھی) کی خبریں بھی تھیں۔ لیکن بھارت میں اس کی ہم سفر ایک نوجوان قانون تھی۔ میں اس کی عظیم شہرت سے بھی متاثر تھا۔ میں گھبرا یا گھبرا یا سارا ج بھون میں داخل ہوا۔ انٹرویو کے وقت جو خود اعتمادی عموماً میرے اندر موجود ہوتی ہے، مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔ مالراکس کا چہرہ اس کی جوانی کی یادگاریں لیے ہوئے تھا، اس کی آنکھیں سوجھی ہوئی ناؤ چہرہ کھنچا ہوا لگتا تھا۔ وہ بہت تیز بولتا تھا، اور اس کی زبان گڑبڑ جاتی تھی۔ مجھے بات سمجھنے کے لیے اکثر سفیر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا۔ اس عظیم انسان کے ساتھ جو گفتگو ہوئی، اس کا مختصر حال کچھ یوں سوال :- اندری کا بیٹے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادیب و شاعر ہمیشہ زندگی اور موت کے مسائل میں الجھ رہے ہیں۔ آپ کی اپنی زندگی میں موت کی بہت سی ستم فریادیں رہی ہیں اور آپ نے ایک خطرناک زندگی گزاری ہے۔ میں اس فلسفہ موت سے متعلق آپ کا نظریہ جانتا چاہتا ہوں۔ ہندوؤں کا نظریہ کچھ اور ہے، اور عیسائیوں کا کچھ اور۔ یعنی ہندو زندگی، موت اور دوبارہ زندگی یعنی آگن پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آپ یقیناً نہیں رکھتے ہوں گے؟

جواب :- میری بہت سی تقریروں میں موت بحیثیت ایک مضمون کے آئی ہے۔ لیکن جب مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ حیات بعد الموت کے بارے میں کیا خیال ہے، تو میں جواب دیتا ہوں کہ میں اس سوال کو فلسفیانہ طور پر سمجھ نہیں پاتا۔ اگر میں اپنے آپ کو مذہبی لوگوں میں شمار کروں، تو میں سوال کو پوری طرح سمجھ لیتا ہوں۔ بصورت دیگر گفتگو بے معنی ہے۔ ہم عیسائیوں سے نہیں پوچھتے کہ کیا وہ زندگی کو دائمی سمجھتے ہیں۔ اگر مذہبی لوگوں سے پوچھا جائے تو یہ نظریہ جیسا کہ میں نے اپنی آخری کتاب میں بیان کیا ہے، لا حاصل ہے۔ ہمارا سوال ہونا چاہیے کہ حیات بعد الموت اور حیات بعد الموت میں کیا فرق ہے۔ تاسخ یا عدم تاسخ میں کیا فرق ہے۔ میں تاسخ میں بالکل یقین نہیں رکھتا۔ جو کچھ اس زندگی سے باہر ہے، یعنی ہمیں سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اصل میں ہمارے خیالات اور عقل کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ہاں

اتنا ضرور کہوں گا، کہ میں رُوحوں کے تسامح کا قائل ہوں۔ اور یہ دہائیت مدلل بات ہے۔
لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ وہ مذہب سے الگ ہو کر حیات بعد الموت کا قائل ہے تو وہ بیوقوف
ہے۔

سوال :- آپ موت کے اتنا قریب رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، کہ آپ
نے موت پر کیسے قابو پایا؟

جواب :- یہ میری پچیس سالہ ریاضت کا نتیجہ ہے۔ اس عمر سے کے دوران موت
مجھ پر اتنی دفعہ حملہ آور ہوئی، کہ مجھے اس کی آمد پر حیرانی نہیں ہوتی تھی۔ موت کا خوف۔
میں اسے ایک اور طریقے سے واضح کرتا ہوں۔ موت کے نظریے کی تدبیریں ہیں۔ ایک
تو طبعی طور پر مر جاتا ہے۔ دوسری موت کی، بعد الطبعیات۔ میں موت کے بعد الطبعیات،
نظریے پر سوچ پکار کرتا ہوں۔ لیکن اپنے طبعی انجام سے بالکل لاپرواہ ہوں

سوال :- موت میرے قریب سے کبھی نہیں گزری۔ پھر بھی میں اس سے خوفزدہ ہوں۔
لیکن آپ ایک ادیب ہیں، اور پھر موت کا تجربہ بھی آپ کو ہے۔ کیا آپ بتائیں گے، کہ آپ
موت سے کیوں خوفزدہ نہیں، جبکہ میں ہوں؟

جواب :- مذہبی اعتقاد کی بنیاد پر تسامح کا قائل ہو جانے اور مغرب کے نظریے پر داز
روح سے ذہنی سکون حاصل کر لینے میں فرق ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ مغربی سائنس کا
کہتے ہیں، کہ انسان غرضی طور پر اس بات پر یقین رکھتا ہے، کہ مرنے کے بعد وہ لاشوں
کی صورت میں ہوں گے۔ یہی وجہ ان کے لئے موت کا خوف پیدا کرتی ہے۔

سوال :- کسی نامعلوم ہستی کا خوف تو دنیا کے تمام مذاہب میں ہے؟

جواب :- یہ ذہنی کوفت کا نظریہ ہے۔ جسے سیرک گارڈ نے پیش کیا، اور اسے
خدا کے مقابلے میں رکھا۔ لیکن میرا ذاتی نظریہ ہے، کہ ذہنی کوفت نامی چیز خالصتاً ما بعد الطبعیات
نہیں ہے۔ ذہنی کوفت کا باعث خارجی عناصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہب پر اعتقاد

یہ سوچنا، کہ مرنے کے بعد ہم لاش میں تبدیل ہو جائیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرا خیال نہیں
ہے کہ آٹھویں صدی کے ہندوستانی موت سے ذہنی طور پر خوفزدہ تھے، اور نہ ہی قدیم روم کے
باشندے ایسا سوچتے تھے۔

سوال :- یہ صرف موت کا ہی خوف نہیں، بلکہ موت کے خوف کے ساتھ ساتھ تکلیف
کا خوف بھی مجھے پریشان کرتا ہے؟

جواب :- یہ ایک الگ سوال ہے۔ ایک پہلو ایسا ہے، جس میں مجھے کوئی تجربہ
حاصل نہیں ہوا، اور وہ ہے تکلیف۔ موت کے تازہ ترین حملے میں بھی مجھے تکلیف کا احساس
نہیں ہوا۔ میں کئی دفعہ زخمی ہوا ہوں۔ لیکن زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی۔ کبھی میرے معدے
میں گولی نہیں لگی۔ بازو نہیں ٹوٹا۔ میں نے کئی جگہ بڑھ چاہے، کہ تکلیف موت کا عروج ہیں
لیکن میں ایسے کسی تجربے سے نہیں گزرا۔

سوال :- آپ کی ساری زندگی اس امر کی خواہی دیتی ہے، کہ آپ نے ڈرامٹک روم کی
نسبت انقلابی جدوجہد میں زیادہ آرام محسوس کیا ہے۔ آپ نے اپنی کئی تقریروں میں اس
حوالہ بھی دیا ہے۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟

جواب :- حقیقی طور پر تو انقلابی تحریکات نہیں ہیں۔ مگر ہر ایک طرح، انسانی شخصیات
ضرور موجود ہیں۔ تمہارے ملک میں انقلاب آزادی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس وقت حقیقتاً
آپ انقلابی تحریک چلا رہے تھے۔ اب روس میں جو تبدیلی آئی، اُسے انقلابی تحریک کا
نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن برزنیف اور لینن کے اقوال میں بہت زیادہ فرق ہے۔ جہاں
میں کانگریس اب وہ قوت نہیں رہی، جو گاندھی کے جیل جانے کے دوران تھی۔

سوال :- میرے خیال میں دنیا کی آئندہ جنگ نسلی امتیاز کی بنیاد پر ہوگی۔ جیسا کہ
جنوبی افریقہ میں کالوں اور گوروں کے درمیان ہو رہا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا انقلاب ہے۔
کچلے ہوئے کالے لوگوں کا۔ آپ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

جواب :- میرے خیال میں اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اقوام اس مسئلے سے باخبر ہیں۔ اس قسم کے حادثے سے پہلے ہی کوئی تدبیر سوچ لیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ تیسری دنیا اور نہ مابعدی میں کوئی مفاہمت ہو جائے۔ مثلاً وہ یہی سوچ لیں کہ پٹرول کے موجودہ ذخائر صرف بیس سال تک پیداوار کے قابل ہیں۔ تبدیلی ضرور آئے گی، اور اسے آنا چاہیے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ بڑی طاقتیں جانتی ہیں کہ موجودہ نظام غلط ہے۔ لیکن اس میں تبدیلی لانے کے لئے ان کے پاس اٹھارہویں صدی کی جمہوری روایات کے علاوہ کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم نئے طریقے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہی اس صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

انقلابی دھارے کے نظریہ کو بھی رد نہیں کرتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جنوبی افریقہ میں لاکھوں ہزاروں انوات ہو جائیں۔ بیا فرامیں بھی لاکھوں افراد مارے جا چکے ہیں۔ جنگ دیش میں بھی۔ مگر ان لاکھوں افراد کے مار دیئے جانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ مغرب جس بے سائنس کی ترقی کی بدولت دنیا پر فتنے حاصل کی، دنیا کو درست رکھنے کے لئے کوئی نظریہ نہیں رکھتا۔ مغرب صرف اقوام متحدہ کے ذریعے دنیا کے ممالک کو متحد رکھنے کے نظریے پر اڑا ہوا ہے۔ میرے ذاتی خیال کے مطابق یہ سراسر حماقت ہے۔

سوال :- کیا آپ گزشتہ سال کے اپنے بیان کی وضاحت کریں گے۔ جس میں آپ نے کہا تھا کہ بھارت اور چین کے درمیان اقتصادی ترقی کے میدان میں اختلافات شدید تر ہو جائیں گے؟

جواب :- ماؤزے تنگ کی موت کے بعد اہم تبدیلیاں ہوں گی۔ لینن کی موت کے بعد روس میں تبدیلی آئی۔ تردینگا اور ٹرائسکی کے بعد کیا ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ دس کے بعد چین میں کیا ہو گا۔ لیکن تبدیلی ضرور آئے گی۔ اس سے زیادہ میں بھارت در چین کے تعلقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا۔

سوال :- آپ نے ایک نہایت خوبصورت بات کی کہ ہر کسی کو دنیا میں ایک مثال چھوڑ جانی چاہیے۔ آپ کے خیال میں آپ اس میں کہاں تک کامیاب ہو گئے ہیں؟

جواب :- میں نے اپنے بارے میں یہ تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میرے ناول "دی ٹوین سنڈرلینڈ" میں ایک کردار نے کہا تھا۔

سوال :- میرا خیال تھا کہ یہ آپ کا فلسفہ ہے۔ ادیب دوسرے کے ذریعے ہی اپنا ما فی الضمیر بیان کرتے ہیں؟

جواب :- یہ درست ہے، مگر وہ کردار ۱۹۳۳ء کا کردار تھا۔

سوال :- اس کا آپ کی ذات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں؟

جواب :- ۱۹۳۳ء میں جب میں نے یہ لکھا، تو اس وقت میرے سامنے ہٹلر تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس وقت جو لکھا گیا، اس کے پیش نظر فاشزم تھا۔ میں کمیونسٹ نہیں تھا۔ اور نہ ہی بائیں بازو کے اتحاد کا انحصار کمیونزم پر تھا۔ درحقیقت بین الاقوامی کے خلاف اتحاد تھا اب چونکہ فاشزم نہیں ہے، اس لئے سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔

سوال :- اس کے باوجود کیا اب آپ یہ نہیں چاہتے کہ دنیا میں کچھ یادگار چھوڑ جائیں؟

جواب :- یقیناً۔ لیکن دلیا نہیں۔ ایک وقت تھا، جب عظیم لوگ ایسا کرتے تھے مگر جنگ کے بغیر تو شاید ہر چل بس ایک بے کیف شخصیت ہوتا۔ جنگ کے بغیر تو شاید جنرل ڈیگال بھی ایک عام جنرل ہوتا۔ اور ہٹلر صرف ایک احتجاج کنندہ ہوتا۔ ہمارا زمانہ جوں کا زمانہ تھا۔ مگر انہیں جن جنگ نے بنایا تھا۔ اب ان کا نشان بھی نہیں۔ یادگار چھوڑ جانے کا نظریہ اب محض الکلی کٹوانے کی بات ہے۔ اور اس میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

سوال :- ایرک ایرکسن نے مائیکل جی کے بارے میں ایک کتاب لکھتے ہوئے تحریر کیا

ہے کہ صرف دو چیزیں اہم ہیں۔ عمل اور خاموشی۔ آپ اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟

جواب :- میرا خیال ہے کہ اس بڑے بیان کے اندر کچھ نہیں۔ ہر چیز پر مطلب نکلتا ہے۔

کہ خاموشی اور عمل، حیرت سے زیادہ اہم ہیں۔ مگر میرا سوال ہے، کہ کیسی خاموشی؟ کیسا عمل؟ کیسی حیرت؟
جب عمل کرنے والا سکندر اعظم تھے، تو عمل عظیم ہے۔ جب اس پر فتوحات کا دورہ بڑھتا ہے، تو وہ
لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ خاموشی۔ خاموشی تو بڑا سہارا ہے۔ لیکن اگر
خاموشی بچے کی سی ہو، تو پھر؟

سوال :- میں آپ کی تقریروں کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ ساتھ سے لکھتے
ہیں، یا ٹائپ کرتے ہیں، یا اپنا مسودہ ڈکٹیٹ کر دیتے ہیں۔ اور کیا لکھنے کے بعد نظر ثانی بھی
کرتے ہیں؟

جواب :- نہیں۔ میں ڈکٹیٹ نہیں کر داتا۔ میں اپنے کام بہت زیادہ نظر ثانی کرتا
ہوں۔ خاص طور پر مکالموں میں۔ اس لحاظ سے ANTIMEMORIES بہت مشکل کتاب
تھی۔ مثلاً نہرو کے ساتھ گفتگو کو بیان کرتے ہوئے میں نے اس کردار کے اصل الفاظ اُسے دینا
تھے۔ بصورت دیگر وہ میرے انداز گفتگو سے مشابہہ ہوتے۔ میرے لئے ایک ہی راستہ تھا، کہ
میں اس کی باتیں غور سے سنوں۔ پھر یہ بھی کہ میں تلفظ کی محنت کا خیال رکھوں۔ اور صرف نقل ہی نہ
کروں۔ اس سب کے لئے محتاط نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال :- کیا یہ درست ہے، کہ سپین کی خانہ جنگی پر آپ کا ناول ایک مہینے میں مکمل ہو گیا تھا؟
جواب :- یہ واقعی سب سے کم عرصہ میں لکھا گیا۔ مگر پھر بھی پانچ ماہ سے اوپر صرف ہوئے۔

سوال :- میرا یقین ہے، کہ جسمانی اور ذہنی قوتوں کے درمیان کچھ مشابہت ہوتی ہے۔ اور
آپ کی شخصیت سے یہ ثابت ہوتا ہے

جواب :- اچھا میں آپ کو اس انٹرویو کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ اور آپ کی تقریروں
کے لئے نیک تمنا کا اظہار کرتا ہوں۔

سوال :- میری کتابیں زیادہ سنجیدہ نہیں ہوتیں۔

جواب :- یہی دالٹھ نے کہا تھا، ”میری کتابیں سنجیدہ نہیں ہوتیں“

کرشنا مینن - اکیلا بھڑیا

ب کرشنا مینن کے بولنے کی باری تھی۔ اُس کے پیشرو کے حصے میں آیا
آتی تھیں، اور ظاہراً مجمع ٹوٹ چکا تھا۔ کرشنا مینن ایسے لوگوں سے نفرت کرتا تھا،
جو اس کی موجودگی میں مجمع ٹوٹ لیں۔ وہ ناراض اور ناخوش نظر آتا۔ وہ مائیکروفون کو
کھینچتا، ملیا لی زدہ انگریزی تلفظ میں چند فقرے بڑبڑاتا، اور پھر میز پر گر جاتا۔ جلسہ
پر خواست ہو جاتا۔ ایک ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی کرشنا مینن کو کسی ہسپتال کے
ایمرجنسی وارڈ کی طرف لے آتی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ انڈیا ٹی وی میں اپنے کمرے
میں موجود ہوتا۔ اُس کا ذاتی معالج ڈاکٹر بھٹا چار یہ جن (بنگالی وزیر اعلیٰ کی ایم پی آے
جو بی سسر مددگار تھے) کے کا باپ) ابھی تو سکوپ کی مدد سے اس کی چھاتی ٹوٹا۔
کمرہ مزاج پر کسی کرنے والے دوستوں، چائے اور قہقہوں سے بھرا ہوتا۔

اگلے روز کے اخبار کرشنا مینن کے متعلق سرخیوں سے بھرے ہوتے، اور جلسے
کی کارروائی کو بے انتہا کوریج ملتی۔

پھر مارڈین میں موجود صحافیوں نے فون کرتا۔ ہمارے پاس خبر رگ
لکھنے والا کوئی نہیں۔ کیا تم مژدہ شناخت کر سکتے ہو۔؟ میں جواب دیتا، کہ مستقبل میں
کرشنا مینن کے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اُسے کن دندہ گرتے ہوئے دیکھا ہے۔
لیکن اگر مجھے لکھنا ہی پڑا، تو اس کی سوانح حیات لکھوں گا۔ اخباروں میں آئے والی یہ
خبریں ہمیشہ مجھے کاسٹ کر بیچ دی جاتیں، تاکہ میں معلومات آپ ٹوڈ پیٹ رکھ سکوں۔

۱۹۴۲ء تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ پھر اس میں کچھ اضافہ ہوا۔ جینیوں نے نہ صرف ہماری دفاعی مشینری کا سنبھال لیا، بلکہ انہوں نے کرشنا مینن کا نام اور ارقی تاریخ سے بھی مٹا دیا۔
 ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۳ء تک پورے پندرہ سال ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر کم از کم ایک سالم ایسا ضرور ہوتا، جس میں کرشنا مینن کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات شائع ہوتی۔
 پھر وہ اچانک شہریت کے اس مینار سے گر گیا، اور اس کی یاد محو ہونے لگی۔ حتیٰ کہ وہ جس خراج تحسین کا وہ حقدار تھا، خدا نے اسے وہ بھی نہ دیا۔ اسے علی الصبح سوادو بجے بلا لیا گیا۔
 اردو دنیا کا آخری میلہ بھی نہ دیکھ سکا۔ ہمارے اخباروں کے صفحے کے ایڈیٹیشن اس کی بحالی محنت کی خبریں دے رہے تھے، اور شام کے اخباروں نے اسے صوفت آدھا کاٹ ہی دیا۔ وہ دنیا کے ہر اخبار میں سیاہ حاشیے میں پہلے صفحے کا حقدار تھا۔ جب میں اس کی ملازمت میں تھا، تو اس وقت ہندوستانی پریس میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ بہت سے غلط لوگ اس کے گرد تھے، جس میں ہندو کے نیشنل ہیرو کا چالا پانچ راؤ، آر کے کرنجیا، اور اس زمانے کا مقبول عام ہفت روزہ بلٹر کا ایڈیٹر وغیرہ۔ بھارت کے تمام صحافیوں کی بنیاد لندن میں تھی۔ ایک، ایلا ریڈ (ہندوستان ٹائمنز) سندھ کا بادی، تار پدیا، تارپانکر سب کے سب اس کے دشمن۔ وہ اپنا پی۔ آر۔ او خود تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے سارنگی کی کتاب "دوست کیسے بنائیں" پڑھ نہیں پڑھی تھی۔

۱۹۴۲ء میں جب میں لندن یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، اس وقت سے میں اسے جانتا تھا۔ اس نے انڈیا لیگ کی بنیاد رکھی تھی جس میں انگریز مرد اور عورتیں شامل تھے، جو بائیں بازو کے خیالات سے متاثر تھے، اور کرشنا مینن کے لئے یا اس کے حوالے سے بھارت کے کام کر رہے تھے۔ اور بھی بہت سی تنظیمیں بھارت کی آزادی کے لئے کام کر رہی تھیں، لیکن انڈیا لیگ سرفہرست تھی۔ باقی تنظیموں کے سربراہ ڈاکٹر، وکیل یا سرمایہ دار تھے، جن کے پاس وقت سے زیادہ سرمایہ تھا، جو اس تحریک میں صرف کر رہے تھے کرشنا مینن

کے پاس پیسہ تو بالکل نہیں تھا، لیکن وقت کی کمی نہیں تھی۔ اسے بار میں کھانے پر مدعو کیا جاتا، جہاں سب لوگ ڈنر چیکیں پس کر آتے۔ اس نے کبھی قانون کا مطالعہ نہیں کیا تھا، اور نہ ہی ایک دھیلے کی رسالت کی۔ اس کا دل قانون کی بجائے سیاست کی طرف راغب تھا۔ احتجاج کی تحریک میں اس کی کامیابی کا راز، مقصد کی پہچان تھا۔ اگر آپ ہند کی آزادی کے خواہاں ہیں، تو آپ کرشنا مینن کی مدد کرنا ہوگی، اس کے علاوہ آپ کسی کی مدد کر کے محبت وطن نہیں کہلا سکتے۔

ٹرائفل سکوائر کے قریب تارکیک اور غلیظ دفتر میں ہم درجنوں ہندوستانی طالب علم پورٹ فولڈ کرتے، لفافوں میں ڈالتے، ٹکٹ لگاتے، اڈریس لکھتے اور پھر پوسٹ بکسوں میں ڈال کر دیتے۔ کرشنا مینن نے کبھی کسی کا شکریہ تک ادا نہ کیا، کیونکہ اس کے خیال میں ہم اس کے حقدار نہ تھے۔

اگر آپ الگینڈ جایش، تو آپ کو کئی ایسے لوگ ملیں گے، جو بتائیں گے کہ انہوں نے کرشنا مینن کے کھانے کے پیسے دیئے، اس کے مکان کا کرایہ ادا کیا، اسے لباس مہیا کیا، لیکن شکریے کا ایک لفظ ان کے حصے نہ آیا۔ اور اگر کسی نے کرشنا کو یاد دلانے کی کوشش بھی کی، کہ اس نے کرشنا کے لئے کیا کچھ کیا ہے، تو یا تو اس نے اس کی بات نظر انداز کر دی، یا پھر اسے سخت سست کہا۔ اس ناشکرے پن کے الزام نے کرشنا مینن کو کبھی پریشن نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اسے دیا جانے والا چلنے کا ایک کپ بھی ہندوستان کی آزادی کی خاطر دیا جا رہا ہے۔

خواتین کرشنا مینن کو خوبصورت مان ہی لیتی تھیں۔ اس میں کسی ہندوستانی فلمسٹار کی سی خوبصورتی نہیں تھی۔ وہ مطلقاً فلینز کی مانند زیادہ لگتا تھا۔ غصے سے لہری سُرُخ آنکھیں، ہراستے ہوئے سفیدی مائیل بال، اونچی پیشانی، جس پر دونوں طرف دو نشان، جو بروس سلیم ہوتے تھے، کہ کسی زمانے میں شیطان کے سینک تھے اور اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک

ناراض سی لکیر چلتی۔ وہ ہمیشہ بے داغ اور نفیس لباس پہنتا۔ برف سے زیادہ سفید ملیالی مندر اور قمیض، اور سنہری حاشیے والی انگاوا سترم (لباس کا نام)۔ وہ جہاں بھی جاتا، وہی سمجھتا کہ اس جیسا رُندے زمین پر اور کوئی نہیں۔ شیکسپئر کے کاسیس سے کرشنا کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ شیکسپئر نے کاسیس کے بارے میں لکھا تھا کہ "دُبلّا ہتلا اور بھوک کی نظروں والا کاسیس بہت زیادہ موچتا تھا، اور ایسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔" کرشنا مینن زندگی کے اچھے لوازمات کا دلدادہ تھا۔ جب وہ اس قابل ہو گیا، کہ اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کر سکے، تو اس کے ضمیر نے کچھ کے دینے شروع کر دیے۔ اس نے بڑی محنت اور لگن سے پچھلے کپڑوں میں ایک میش پرست فافہ کش کی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔ اس نے اپنی تنخواہ جمع کی، ان خبروں کی تردید نہ کی، کہ وہ تنخواہ نہیں لیتا۔ اور ہائی کمشن کے ایک کمرے میں قیام کیا۔ اُس وقت اس نے کاندوں کے ایک بیڑے کا حکم دیا، جس میں ایک رد لوز رائس، اُس کے ذاتی استعمال کے لئے بھی تھی۔ مینن کی طرح کبھی کوئی وزیر دفاع کاروں اور موٹر سائیکلوں کے جلو میں سر دکھوں پر نہیں ددڑا۔ جب وہ وزیر بن رہا، تب بھی وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا، لندن اور نیویارک کے اعلیٰ ترین، ہوٹلوں میں ٹھہرتا رہا۔ مہرمت کھانے پینے میں اُس نے سادگی برقرار رکھی۔ وہ بہت کم کھاتا تھا۔ پاپا دم، دادا اس بائیکین بسکٹ۔ وہ ڈیموٹرین تھا۔ مین سے تیس کپ چائے روز پیتا تھا۔ اور سولے کے وقت چائے میں لیچوں پھونک کر پینا، اس کا بہترین مشروب تھا۔ مینن کی ذہانت پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ لیکن اس کی قلبی رپورٹ یا بحیثیت وکیل کارکردگی میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کی یہ صلاحیت ۱۹۴۵ء تک پورے طور پر ابھری تھی، اور پنڈت نہرو نے اسے دریافت کیا۔ مینن میں انتظامی صلاحیت بہت کم تھی۔ وہ اکثر اوقات چیزوں کا توازن بگاڑ دیتا تھا۔ پنڈت نہرو نے اس کی سرپرستی کی۔ پنڈت نہرو ایک مشفق باپ کا کردار ادا کرتے رہے، اور کرشنا مینن ایک

جگڑے بھڑٹے بچے کا۔ جو ہر ناپسندیدہ شخصیت کے منہ پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا، یا اس پر تنقید کرتا۔

وہ کمال بے خوفی سے سینئر سول سروسٹس اور ٹائٹو سٹار جرنیلوں کی بے عزتی کر دیتا۔ دھمکی کے طور پر استعفیٰ دے دیتا، اور پھر واپس لے لیتا۔ مینن نہرو کا مذاق اڑاتا۔ پنڈت جی کے پرائیویٹ سیکرٹری کو کالیاں دیتا۔ جنی اکر کا مینن کے وزیروں کو اُن پر طعنه لگاؤ دی سمجھتا۔ پیرس میں ایک میننگ کے دوران اُس نے بھارت کے سفیر سردار پانچ ایس ملک کو اتنا ذلیل کیا کہ اٹھا پاٹی کی نوبت آتے آتے رہ گئی۔ سفید فام لوگ اس کا من پسند نشانہ تھے۔ وہ سفید فاموں کے کانوں پر صدیوں کے ظلم کا تنہا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے یہ رویہ اس قدر جوش و جذبے سے اپنایا، کہ اپنے پرانے اس کے دشمن بن گئے۔

عام طور پر وہ مسئلہ کشمیر، قوام متحدہ میں مسلسل تیرہ گھنٹے تقریر کرنے پر مشہور رہے۔ ظاہر اُردو بھارت کے موقف کا ہر پہلو واضح کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں مینن کی وجہ سے ہماری دوستی یورپ، امریکہ اور چین سے ختم ہو گئی، لیکن اس کے عوض اس نے روس، عرب اور افریقیوں کو ہمارا دوست بنا دیا۔

کرشنا مینن پنڈت نہرو کی تخلیق تھا۔ ۱۹۴۲ء میں چینی حملے کے بعد جب نہرو کا اپنا ستارہ دھندلانے لگا، تو کرشنا مینن کی سخی آگئی۔ نہرو کی موت کے بعد کرشنا مینن کی شہرت کا ستارہ بھی ڈوب گیا۔ کیمونسٹوں نے اسے خون دینے کی کوشش کی، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ مینن نے سپریم کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ اسے کچھ مقدمے ملے، لیکن اس نے ملا کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور کئی موقعوں پر جموں کو یاد دہانی کرائی بڑی، کہ وہ عدالت میں بحث کر رہا ہے، کسی سیاسی جلسے سے خطاب نہیں کر رہا۔ پھر کوئی مقدمہ اس کے سامنے نہ آیا۔ تاریخ مینن کو کین الفاظ میں یاد کرے گی۔ ایک بے بنیاد انتشار کی مانند یا کسی شہاب ثاقب کی طرح۔ جو چمکا، تو ہر ستارہ ماند پڑ گیا، اور جب ٹوٹا، تو جہاں جہاں گرا،

وہ جگہ جلا دی، اور پھر خود بھی نابود ہو گیا۔ تیسری دنیا کے ممالک کی ناوابستگی، اس کا نہیں، پنڈت نہرو کا منصوبہ تھا۔ عربوں کے حقوق اور افریقیوں کی جدوجہد کے ساتھ اصل میں پنڈت جی نے دیا تھا۔ لیکن یہ مبینہ تھا، جس نے ان منصوبوں پر تقریر کی، اور ان کو اپنے کھانے میں ڈال لیا۔ کیونکہ وہ الفا کو رائج الوقت سکے کی مانند ڈھال سکتا تھا۔ یہ وہی سرشنا مینن تھا، جس نے پاکستانی جارحیت کی مذمت کی تھی، اور حیدر آباد اور گواکو پولیس کے حوالے کرنے کو کہا تھا۔

مینن کوئی زیادہ عالم فاضل شخص نہیں تھا۔ اس کی اصل تعلیم ہیرلڈ لاسکی، اور لندن سکول آف اکنامکس تک محدود تھی۔ طباعت کتب میں اس نے چند روز گزارے۔ اس نے پبلیکن کتابوں کا صرف پہلا صفحہ ایڈٹ کیا تھا۔ سیاست نے اسے اخبار کے علاوہ مطالعے کے لئے وقت ہی نہ دیا۔ لیکن نہ جانے وہ دوسرے سیاستدانوں اور پارلیمنٹروں سے بڑتر کیوں تھا۔ ویسے بھی ہندوستانی سیاستدانوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے بڑتر ہونا کوئی مشکل نہیں۔

سرشنا مینن نہیں جانتا تھا، کہ دوست کیسے بنائے جاتے ہیں۔ البتہ اس میں دھوکا کھونے اور دشمن پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس نے بے شمار حاشیے کیے، اور کئی دل توڑے۔ اس نے محبت حاصل کی، اور چونکہ وہ محبت دے نہیں سکتا تھا، اس لئے یہ میدان بھی خاما سرد رہا۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں مہرمت ایک ناظم کے ساتھ اس کے مراسم تھے۔ ایک رنگین، قابل دیدار شاندار شخصیت کا یہ افسوسناک انجام ہے۔

فرینک مورس

جب انسان مرجاتا ہے، تو سچ ختم کرنے کے لئے کسی کنونشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فرینک مورس کی موت کے بارے میں خبروں پر اس کے دوست کم ہی یقین کرتے تھے۔ وہ ایسا شخص تھا جو شراب، عورت اور اپنے کام سے اسے ایک جیسی لگن تھی۔ شراب نوشی کے دوران وہ اکثر ذہنی طور پر حاضر ہوتا۔ اپنے خیالات صفحہ قرطاس پر تحریر کرتا، اور جرأت سے کہتا، کہ جو اس نے سوچا ہے، بالکل درست ہے۔ اس بہت سی اعلیٰ خوبیوں میں سے ایک یہ تھی، کہ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتا، اور مقدمہ روبرو کرنا، کہ لوگوں کے کام آسکے۔

ہندوستان ٹائیڈز کے ایڈیٹر دیو داس گاندھی نے جرنلسٹوں کی مینگ کی، تو وہاں میری ملاقات پہلے ہارنٹیک مورس سے ہوئی۔ مینگ اس امر پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی تھی، کہ حکومت کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کا کیا کیا جائے۔ دیو داس جتنا پابندی کے حق میں تھا، فرینک مورس اتنا ہی مخالف۔ پہلا خیال تھا، کہ دونوں میں زبردست اختلافات ہوں گے۔ دیو داس کا خیال تھا، کہ اس کے زیادہ وزن دار ہیں، اس لئے فرینک کو اس کی بات مان لینا چاہیے۔ فرینک نے بڑا مشکل تھا، اس کی بڑبڑاہٹ سے جو ظاہر ہوا، وہ محالیاں تھیں، مہراجی ڈیسا کی کے لئے، دیو داس کے لئے، اور دوسرے سمجھاؤں کے لئے۔ اس بحث کا نتیجہ جذباتی شور و غل کے علاوہ کچھ برآمد نہ ہوا۔

فرینک موریس اسرائیل کا زبردست حامی تھا، اور صدر نامہ رکابے رقم نقد۔
 کنگلے مارٹن جو ان دنوں میرے پاس دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا، مجھے ایک واقعہ سنایا:-
 یہ واقعہ ایک ڈنر پارٹی میں پیش آیا۔ جو عرب لیگ کے ایک نائندے کے حکمران
 معقود نے ترتیب دی تھی۔ اور قومی اخبارات کے مدیروں کا مصری سفیر سے تعارف
 کروایا جانے والا تھا۔ فرینک کو بہت اہم جگہ پر بٹھایا گیا۔ اس کی عزت افزائی کی گئی۔
 سفیر کی بیگم کے برابر جگہ دی گئی۔ بات چیت کے آغاز کی خاطر معقود نے فرینک سے صدر نامہ
 کی اسرائیل کے ساتھ امن کی کوششوں کے بارے میں رائے لی۔ صدر نامہ مجھوٹا ہے۔
 فرینک نے جواب دیا۔ معقود کو شاید سننے میں غلطی لگی۔ اس نے اپنا سوال پھر دہرایا۔
 موریس نے سنا کہ بے تکلفی سے اپنا جواب دہرایا۔

اُسی وقت مہمان خصوصی اور اُن کی بیگم دعوت چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈنر سبھی خاتونوں
 میں ختم ہوا۔ کنگلے کا کہنا ہے، کہ فرینک موریس نے اس دن پارٹی میں شراب کو ہاتھ
 تک نہ لگایا، اور کمال سنجیدگی سے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے میزبانوں سے اپنے درشت
 رویے کی معذرت طلب کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

اگر فرینک موریس سلورسٹون کے پاس نہ گیا ہوتا، تو آج سے دس سال قبل جگر
 کی سوزش کی وجہ سے مر چکا ہوتا۔ یہ نوجوان، خوبصورت اور محنت مند، اور جرأت مند
 فری لانس فوٹو گرافر فرینک کی قریب ترین دوست بن گئی۔ اس نے بیماری میں
 اس کی تیمارداری کی، شراب نوشی پر قابو پایا، اور اسے ایک بیوی کی مانند آرام
 مہیا کیا۔ کچھ تک ہونے کی بناء پر فرینک کے لئے یہ ممکن نہ تھا، کہ وہ بیوی کو طلاق دے
 سٹون سے شادی کر لیتا۔ لندن میں سٹون کے گھر میں فرینک کی موت ہوئی۔ تاہم کبھی
 بھی اس امر کی برائی کی تعریف میں دو الفاظ نہ لکھے۔

فرینک کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے ڈوم کی سوانح عمری پڑھنی چاہیے۔
 میرے بیٹے کا باپ، اُس نے اپنے دادا کی تمام خوبیاں ورثے میں حاصل کیں۔
 وہ اپنے باپ سے زیادہ حساس تھے۔ اپنے دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے۔
 اور اتنی زیادہ پی سکتے تھے، جتنی فرینک اپنی جوانی کے دنوں میں پیا کرتا تھا۔

گرو دیو - مکت آنند

بمبئی سے پچاس میل دور، لیکن بمبئی کے پشاور پورم سے ہزاروں میل دور یہ جگہ میں نے پہاڑی کی ایک چوٹی سے دیکھی تھی۔ براؤن رنگ کے کھیتوں میں جگہ جگہ جاول کاشت کیے دیکھے تھے، اور بعض علاقے ایسے تھے گویا شیو کے گھٹے ہوں۔ پہاڑیوں کا ایک دائرہ جن کے نام ایسے ہیں، جیسے مندروں کی گھنٹیوں کی آواز۔ شمال میں مندر لائی، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، اور تنگاشور جہاں یہ غروب ہوتا ہے۔ اور اس وسیع و عریض وادی کے جموں پنج سنہری دھاگے کی طرح تجماساندی بہتی ہے۔ ٹیک کے درختوں کے بڑے بڑے پتے جھکے پڑے ہیں۔ پیل اپنی تازہ کھال اور رے کھڑا ہے، اور ریشمی کپاس کے بھول کھلنے ہی والے ہیں۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ذہنی بیڑیوں کو چارج کر کے لئے اس سے بہتر جگہ رکڑ زمین پر کوئی نہیں۔ میں تو دریاں مروت یہ دیکھے گیا تھا، کہ آیا میری روحانی بیڑی میں کوئی سپارک باقی ہے؟ میں بابائیکت آنند کو ملنے گیا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں، کہ تمہارے آباؤ اجداد نے بے شمار جگہوں اور سواری پیدا کیئے ہیں۔ اور اگر تم اپنی اسی عمر میں مذہبی شخصیت سے حار ہے ہو، تو اپنے قارئین کو اس کے اثرات سے بھانا۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ میں نے۔ لیکن لوگ جہاں ہیں، میں ان کو دماغ سے ہٹا نہیں سکتا۔ ان کے تجربات تھ سے مختلف ہیں۔ وہ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں تجسس ہوا اور تجسس مزید ہے۔

دس پندرہ روز ہوئے، ایک رات میری ملاقات بالیوگیشور سے ہوئی۔ میں نے اُسے کسٹم کی شکلات کے متعلق یقیناً نہیں پوچھا تھا۔ میں ایک گھنٹہ مایوگ شکتی سرسوتی کی حاضری میں رہا۔ میں اُن لوگوں سے بھی ملا، جو کہ شتا کے پجاری ہیں، لیکن مجھے کسی آشرم جانے کا اتفاق نہیں ہوا، اور مکت آنند جی کا دمبریشوری کا یتیم خانہ بہت موزوں بنایا گیا ہے۔

آشرم میں کئی اقسام کے ہیں۔ محاندہ میں جی نے ٹائٹل فارم اور سبرامتی آشرم بنا رکھا تھا، جہاں اُن کے پیروکار اپنا کھانا خود تیار کرتے تھے، اور اپنے لئے کپڑا خود بناتے تھے۔ عبادت کی بجائے کام پر زیادہ ندر تھا۔ جے پرکاش نرائن کا بھی الگ کھانا تھا، جہاں مروت کام ہی کام تھا، عبادت کا ذکر ہی نہیں تھا۔ گورو دیو مکت آنند کی بات ہی اور ہے۔ زیادہ وقت عبادت اور مراقبہ میں گزارا جاتا ہے، اور کھوڑا وقت کام ساج کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی عبادت خاص برہمچاری ہے۔ سنگ مرمر اور چاندی کا بے انتہا استعمال کیا گیا ہے۔ قیمتی مالین اور فرنیچر، جدید بیگلے سبز لہوں، پھلوں کے باغات، جہاں، ٹماٹر، کیلے، آم، چیکو اور پیتا کی کاشت کی گئی ہے۔ اور ایک سالانہ محفل جس کا نام سواری وجے آنند ہے، اور جو چارے کے لئے اپنی سکوڑاؤں پر اٹھاتا ہے، لیکن اُسے سب سے زیادہ آم اور غیر ملکی چاکلیٹ پسند ہیں۔

مکت جی آنند، دوسرے گوروؤں سے مختلف ہیں۔ ٹیک ڈڈ سے تیار کیئے گئے استقبالیہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں جہاں ان کا انتظار کر رہا تھا، جب وہ داخل ہوئے، تو مجھے یوں محسوس ہوا، کہ ایک ایسا شخص سامنے ہے، جس کی لاکھوں لوگ خدا کی مانند پرستش کرتے ہیں۔ ان کی لنگی اور قمیض سنبا سیوں جیسی تھی۔ ان کی ریشمی ٹوپی پر پسینہ تھا۔ گہرے شبیوں کی عینک لگائے وہ ایک بے عمل سی شخصیت لگ رہے تھے، جب وہ سر دیکھ لگے مرنے پر سبھ گئے، تو ان کے رویے سے دوستی

اور بھائی چاچے کی عجیب خوشبو سرائند ہوئی، جس کا بچے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔
”میں آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں“ میں نے کہا۔

”یقیناً“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں اپنی عقل کے مطابق بہترین جواب دے گا۔ سب سے پہلے آشرم پر ایک نظر کیوں نہ ڈال لی جائے۔ پھر واپس آکر کچھ سے جتنے جی چاہے سوال کرو، بلکہ جس سے جی چاہے، پوچھو۔“

بچے سرائند سے کمرے، ڈاسٹنگ روم اور لائبریری دکھائی گئی۔ بچے سرائند نما کمرے میں لے جایا گیا، جو مراقبے کے لئے مخصوص تھے۔ وہاں میں نے کئی مرد، خواتین کو دیکھا۔ انہیں سب نے خبر پایا، جو کمرہ میں رکے پدم آسن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

سہ پہر کے بعد مکت آنند جی مراقبے کے کمرے میں آئے۔ انہوں نے اپنے غیر ملکی پیروکاروں کو طلب کیا۔ چار امریکی اور ایک فرانسیسی لڑکے ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ مکت آنند جی بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ ہندی اور مراٹھی سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے۔

”لوگ آپ کے پاس کیوں آتے ہیں۔“ میں نے ہندی میں پوچھا۔

”مختلف وجوہات کی بنا پر۔ کچھ ناخوش، کچھ پریشاں اور کچھ تجسس۔“

سوال :- ”وہ آپ سے کیا حاصل کرتے ہیں؟“

جواب :- ”وہ ذہنی سکون حاصل کرتے ہیں۔ مراقبے کے ذریعے وہ اس

قابل ہوتے ہیں کہ آپ کو اور خدا کو، جو ہر ایک کے اندر ہے، جان سکیں۔“

سوال :- ”کیا ذہنی سکون ہی ایک فقط مقصد حیات ہے۔ میرے خیال میں یہ

خود غرضانہ باعث ہونگے۔ ایک انسان کو اپنی نسبت دوسروں کو زیادہ دینا چاہیئے۔“

جواب :- ”وہ ایسا نہیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہے، جب کوئی

شخص خود مکمل طور پر سکون حاصل کر لیتا ہے، تب وہ دوسروں کو بھی اس میں سے حصہ دیتا ہے۔“

ان کے چیلے بھی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں، اما، میانہ اور چندرا سب امریکی ہیں، لیکن ہندوؤں جیسے نام رکھ لیے ہیں۔ ”ہم صرف گھر سے بھاگے ہوئے بچے نہیں ہیں۔ ہم اپنے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔“ وہ کہتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ پہلے انہوں نے اپنی پریشاںیاں منشیات کے ذریعے دور کرنا چاہی تھیں۔
سوال :- ”پھر اب کیسا لگتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

جواب :- ”میں اس وقت بھی زیادہ خوش نہیں ہوں، لیکن مجھے سکون مل رہا ہے۔“

ان میں سے ایک جس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی ہیں، غالباً میانہ ہے جو اب رہی ہے۔ سوال :- ”سکون سے دنیا میں کوئی قابل ذکر چیز تو پیدا نہیں ہوئی۔ یہ تو ذہن کی

بے آرام کرنے والی چیز ہے، جس کے نتیجے میں ادب، موسیقی، سائنس میں شاہکار تخلیق کیے گئے۔ یہ برقی ساز و سامان، پنکھے، ایئر کنڈیشنرز، بلب وغیرہ وغیرہ یہ سب ان لوگوں کی ایجاد ہیں، جن کو ذہنی سکون نہیں تھا۔ دنیا ان کی تکلیف سے فائدے میں نہیں۔“

جواب :- ”مہم اتنے خوش ہیں کہ ہم کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہی۔“

سوال :- ”یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔ آخر سائنسی ایجادات، مصوری اور موسیقی کے بغیر دنیا کیسی دنیا ہوگی؟“

جواب :- ”جو کچھ ہمارے پاس ہے، ہم سب اس کو اچھی طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم سب مائیکل اینجلو یا بھگوان ترہن نہیں ہو سکتے۔“

سوال :- ”لیکن یہ مراقبہ، تو میری نظر میں وقت کا ضیاں اور خود غرضی کا حامل ہے۔“

میں تو کوئی کتاب پڑھنے یا آنکھیں بند کر کے جلنے کی بجائے حقیقتاً سونا زیادہ پسند کروں گا۔“

سب ہنسنے لگے ہیں۔ مکت جی اپنے سب سے قریبی چیلے سری باندی سے پوچھتے

ہیں کہ کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ وہ مختصر ماری بات بتاتے ہیں۔ گورو دیو بچے بات بات

رکھنے کو کہتے ہیں۔

سرا حیل ہے کہ مکت آئند صاحب ہر ایک کو اپنی قربت کا احساس دلادے
ہیں۔ میں ان سے ملنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ان کی نظروں میں مثبت ہی تھا
تحت ہے۔ اتنے مختصر وقت میں کسی لیے آدمی سے قربت کا احساس مجھے پہلے کب
نہیں ہوا۔ ہم بحث کرتے رہتے ہیں، اور بالآخر مراقبہ اور کام کے تعلق پر رک جاتے ہیں۔
”تم خود اس کا تجربہ کیوں نہیں کرتے۔“ اُما کہتی ہے، جو شرح کا نیز لیرڈ مرتب
ہی ہے۔ ”کسی ایسے شخص کو جاکلیٹ کا مڑا کھانا بڑا مشکل ہے، جس نے کبھی بھی
چاکلیٹ کو چکھا بھی نہ ہو۔“

فصل ختم ہو جاتا ہے۔ اب پروفیسر جن اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ
مجھے حاد زبج کرتا ہے۔ ”ہر کوئی اپنا کام اپنی صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے۔ تم
بہت روزہ مرتب کرتے ہو، اُما ہمارا نیز لیرڈ۔ دونوں یکساں اہم ہو۔“ میں اپنی
عالمی کر تلم کرتا ہوں۔ وہ مسکراتا ہے، اور بات جاری رکھتا ہے۔ ”شبکیسیر کو اپنی
لنٹیں اور ناول لکھنے میں ایک عمر گزر گئی۔ ہمارے گورڈو دیو نے صرف سترہ دنوں
میں ”سٹشٹ شکی ولانس“ لکھ دیا ہے۔ یہ غیر کے متعلق ایک ڈرامہ ہے۔ یہ شبکیسیر
کی ہر تحریر سے بلند ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ذہنی آئین یا ترکیب کی وجہ سے نہیں
کرتے، بلکہ اس کا باعث ہمارے ذہن کا مکمل سکون ہوتا ہے۔“

لڑکیوں کا حیل ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے معذور نہیں ہیں۔ اگرچہ آشرم کی
زندگی سکون کا کام کی زندگی ہے۔ تاہم صبح ساڑھے تین بجے اٹھا، سارا دن کام، عبادت
اور مراقبہ کرنا اور وہ نہایت پابند محول میں کرنی کا سامنا نہیں۔“

”آخر کس مقصد کے لئے۔“ میں پوچھتا ہوں۔ ”میں خدا پر یقین نہیں رکھتا،
اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں، تو پھر میں اپنے اندر کے خدا کی تلاش کیا کروں۔“
”تمہارے اندر اس سے کہیں زیادہ اعتماد ہے، جو تم بیان کر رہے ہو۔“ تمام

لڑکیاں ایک دم ہل اٹھتی ہیں۔ ”اُٹو ہمارے ساتھ چند دن آشرم میں گزار
سہ دیکھو۔“

”تم جس خیر بھروسہ لڑکیاں مجھے راہ سے بھٹکا دیں گی؟ میں کہتا ہوں۔
وہ خوشی سے مسکراتی ہیں۔“

میں مکت آئند جی سے اجازت لیتا ہوں۔ اور اُن گستاخ سوالوں کی سفا
طلب کرتا ہوں، جو میں نے اُن سے اور اُن کے چیلوں سے کیٹے تھے۔ وہ میرے کندھے
پر ہاتھ رکھتے ہیں، اور کہتے ہیں۔ ”یہ سوال گستاخ نہیں تھے، ایمانداری پر مبنی
تھے، تم پھر بھی آ سکتے ہو۔“

میں پھر وجہ پوری جاؤں گا۔ دوسرے لوگ تو اپنی روحانیت تازہ کرنے
جاتے ہیں، لیکن میں پچھلوں میں لگی سُرُخ آگ دیکھنے جاؤں گا۔ پہاڑوں کی تازہ اور
صاف ہوا میں سانس لیں گا۔ اور مکت آئند جی سے اس بات کی ضمانت لیں گا،
کہ میں اتنا گستاخ نہیں ہوں، جتنا اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔

منظور قادر۔ ایک بچہ اہل دوست

میرا نبایت ہی عزیز دوست بستر مرگ پر پڑا ہے۔ میں اس کی مزاج پر سی کے یہ نہیں جاسکا۔ اس کے بیوی بچے بڑے سے ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے فاصلے پر تھے میں ان سے ملنے نہ جاسکا۔ میں ان کو خط نہ لکھ سکا نہ ہی فون پر حال معلوم کیا وہ پاکستانی ہیں۔ میں بھارتی ہوں۔ ہم کیسے ہمسائے ہیں۔ کیا ہمیں مہذب کہلانے کا حق ہونا چاہیے۔

میں نے اخبار کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔ ایک دوست فون پر مجھے بتا کہ میرا پرانا یار چلا گیا ہے۔ خون میری رگوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔ میں نے اخبار رومی کی نوکری سے نکالا۔ سیاہ اور سفید پیٹی میں لکھا تھا منظور قادر کا انتقال ہو گیا جب وہ لندن میں آخری سانس لے رہا تھا۔ میں بھی مین روڈ بھارتی سن رہا تھا اور شاہی کی خپکیاں لے رہا تھا اور جب اسے لاہور میں آبائی قبرستان میں اتارا جا رہا تھا میں کو لاہور میں اپنے ہاتھ افسوس سے مل رہا تھا۔ وہ پاکستانی تھا میں بھارتی۔

کہا جاتا ہے کہ جب کوئی مر رہا ہو تو اس کی ساری زندگی اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے منظور قادر کے مرتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرا ہوں گا کیونکہ وہ بھی مجھے ایک عزیز دوست کی مانند سمجھتا تھا سارا دن میں ہی یاد کرتا رہا میری اس کی پہلی ملاقات کیسے ہوئی اور ہم یکے دوسرے کے قریب کیسے آئے۔ تیس سال قبل پہلی ملاقات میں ہمارے درمیان موضوع زیر بحث موت تھا اس کی بیوی مغری کے بھائی نے اپنے باپ میاں فضل حسین کو مغری

خط لکھا تھا میں اس کے رفیق نس ویتا رہا۔
میں موم بتی کی روشنی میں کام کر رہا ہوں
اس کا شعلہ بجھ چکا ہے
یہ ختم ہو گئی ہے

منظور قادر تصانیف کا مجموعہ تھا طالب علم کی حیثیت سے وہ کوئی زیادہ روزگار نہیں تھا۔ لیکن وہ پاکستان کا قابل ترین وکیل بنا۔ قانون کے بعد اس کی زیادہ دلچسپی عہد نامہ عقیق اور قرآن کا مطالعہ تھی۔ وہ شروع سے آخر تک لاہوری نظریہ پر کاربند رہا۔ وہ ایک اچھا شاعر تھا اور اردو زبان میں اس نے چند بہت اچھی نظمیں تخلیق کیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتہا درجے کا رجعت پسند، تقریر میں ناپ تول رکھنے والا اور سلیقے سمجھاؤ کا قائل تھا اگرچہ پنجابی گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن ہندوستانی زبان کا رہا تھا اور بڑی صاف زبان بولتا تھا۔ وہ بڑا مفصل بیان تھا لیکن بور نہیں کرتا تھا وہ منشیات کا مخالف تھا لیکن گفتگو میں شہین کی بوتل کی طرح زندہ دل کے بیلے چھوڑتا تھا۔

اس کے کردار کے نمایاں پہلوؤں میں روم و فکر، دیانتداری تھی اس نے کبھی کسی کے بارے میں نقصان دہ گفتگو نہیں کی۔ اس کی دیانت داری ایمان کی حد تک وسیع تھی وہ پچاس ہزار روپیہ ماہوار کاتا تھا۔ لیکن انکم ٹیکس والے ہر سال اسے زائد جمع ہونے والا ٹیکس واپس کرتے تھے۔ وہ روپے پیسے کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا تھا اس کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے منظور قادر نہیں۔ اس کے اندر ولیوں کی سی سچائی تھی۔

دوستوں کی نظر میں اس کی عزت و توقیر بے مثال تھی تقسیم ہند کے پھر طے بعد ہم بچہ دوست جی ڈی کھوسلہ کی کتاب *INTERVIEWING* دیکھ کر گفتگو کر رہے تھے جس میں اس نے تقسیم کے دوران مشرقی پنجاب میں ہونے والے فسادات کو گناہوں کی سزا ثابت کیا تھا ہم کھوسلہ کو اس کے کڑبان پر دیدہ ہے

تھے۔ وہ اور اس بیوی ہمیں دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش میں تھے ایک دوست نے کھوسلہ نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر کہا کہ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دلائل بھی ختم ہو گئے۔ ہمیں احساس تھا کہ منظور قادر کا دلائل کیا ہو گا۔ صحیح یا غلط۔ وہ ہماری اخلاقی انداز کا ستون تھا۔

منظور قادر کو بیانات سے کوئی پرلحی نہیں تھی اور وہ اخبارات پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ بین الاقوامی حالات نے اس کی نادانیت بے پایاں تھی۔ لندن میں ایک دن ہمیں ڈاکٹر سن یات سن کی ایک نیوز ویل دیکھنے کا اتفاق ہوا منظور نے مجھ سے پوچھا یہ سن یات سن کون تھا۔ جب میں نے اس کی واقفیت عام کے بارے میں تشریح کا اظہار کیا تو کہنے لگا ہونکا سال کوئی بنگالی ڈاکٹر۔ بعد میں شام کو جب میں نے یہ واقعہ اس کی بیٹی شیریں کو بتایا تو اس نے اپنے باپ کو برا بھلا کہا اس نے مجھ سے قسم لی کہ میں کسی اور کو یہ واقعہ نہیں بتاؤں گا۔ میں نے اپنا وعدہ نبھایا لیکن جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ صدر پاکستان محمد ایوب خان نے منظور قادر کو وزیر خارجہ مقرر کیا ہے تو میں نے مبارک باد کا تار بھیجا جس پر دیکھا تھا بنگالی ڈاکٹر سن یات سن کی طرف سے مبارک باد۔

جب وہ وزیر خارجہ تھا اس وقت میں نے اس کے ساتھ چھٹیوں کے چند دن گزارے میں اپنے گھر میں خود ہی مہمان کی حیثیت سے رہا ۱۹۴۷ء میں جب میں نے لاہور سے ہجرت کی تو اپنا گھر منظور قادر کے حوالے کر دیا تھا جس نے اس کی خوب حفاظت کی۔ ہمارے سکھ نوکر دوں کی جان بچائی۔ رات کو نہیں بجا طت مرحد پار کمر وانی۔ فرنگچر اور میری لائبریری کی تمام کتابیں مجھ تک پہنچائیں حتیٰ کہ میری شرب کی عمارت میں بھی کچھ شراب بھی روانہ کر دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ وزیر خارجہ کیسے بنا اس نے محمد ایوب خان کے آمرانہ رویے پر ایک میٹنگ میں سخت تنقید کی تھی۔ اس رات ایک ملڑی جیپ اسے لے جانے آئی یہ جان کر کہ اسے گرفتار کیا جا رہا ہے اس نے اپنے خاندان کو خداحافظ کیا۔ اسے صدر کی رہائش گاہ سے جایا گیا۔

ایوب خان نے اس سے کہا: تم اگر مجھ پر یا میری حکومت پر تنقید کرتے ہو تو پھر تمہیں اس ذمہ داری کا اہل ہونا چاہئے۔ اور ان خامیوں کو درست کرنا چاہئے جن پر تم نے تنقید کی ہے۔ منظور قادر جب گھر واپس آیا تو وہ وزیر خارجہ بن چکا تھا۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے منظور قادر تو کبھی کسی عہدے یا اقتدار کی خواہش نہیں تھی۔ وہ کبھی کسی سے الجھنا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو اس قابل سمجھنا تھا کہ اس سے الجھا جائے۔ وہ سیاستدانوں کی باتوں کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اپنے چار سالہ وزارت خارجہ کے دور میں اس نے بھارت سے بہتر تعلقات قائم کرنے کی سرنور کو کوشش کی لیکن جب اس نے یہ عہدہ چھوڑا تو اسے تاسف کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اس نے مجبوراً چیف جسٹس کا عہدہ قبول کیا اور جب اسے چھوڑنا چاہا تو حکومت نے اسے مجبور کیا کہ وہ ایسا نہ کرے اس نے حکومت کے خلاف ہر سازش کیس میں بین الاقوامی شہرہ مول کے سامنے حکومت کی اعانت کی۔ سکندر مرزا ہو یا ایوب خان، یحییٰ خان، یا بھٹو۔ پاکستان کا کوئی بھی عکرم منظور قادر کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ گزشتہ سال میں نے مری میں تنہا گلی میں اس کے ساتھ ایک دن بسر کیا وہ بہت بیمار تھا۔ اسے

کی بیماری تھی۔ لیکن پرانی دوستی کی خاطر وہ اسلام آباد تک کار چلاتے ہوئے مجھے لینے آیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جنرل ٹکا خان سے لے کر ادنیٰ ترین لوگ بھی اسے راستے میں کٹنے عزت و احترام سے ملے۔ ہر قدم پر سلام تسلیم کرنے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے اپنی بیماری کی صعوبتیں نہایت بے جگری سے برداشت کیں اور مذہبی اعتقادات کا سہارا لینے سے انکار کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی زندگی اب چند روز ہی رہ گئی ہے لیکن اسے موت کا کوئی خوف نہیں تھا مجھے یاد نہیں آ رہا کہ وہ اور کب کو ایسا سفر گزرتا تھا یا کہ نہ تھا لیکن اس کا مطلب کچھ ایسا تھا اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میں اس تاریکی کا ایک وہن کی طرح استقبال کروں گا۔ اور اپنے آپ کو اس کے بازو میں

دسے دوں گا۔ ہماری آخری ملاقات کے اختتام پر اس کی بجائے میسرے آنکھوں میں آنسو تھے۔

نشانِ مردِ مومن بانو گوہر

چو مرگ آید تبسم بر لبِ دوست

لندن کے اسپتال میں اس کی گرتی ہوئی صحت کے متعلق ایک انگریز دوست نے مجھے بتایا۔ لیکن وہ بھی اس کی موت کے وقت وہاں نہیں تھی منظور قادر جیسے دوست کے لیے خراجِ تحسین صرف آنسوؤں ہی سے لکھا جاسکتا ہے لیکن یہ آنسو کاغذ پر گرنے نہیں چاہتے اسے دوامی عزت حاصل ہے اور اس کی موت کا غم بھی دائمی ہے۔

ڈاکٹر اسرار دھاکرشن۔ ایک تخلیقی جہ

حیاتِ انسانی اولیٰک گیمز کی مانند ہے۔ پیشِ غورث نے لکھا تھا کچھ تو کامیابی حاصل کرتے ہیں کچھ کامیابی کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ محض تماشا ہی ہوتے ہیں اور یہ آخری آخری گیمز وہ فلاسفروں کا ہے۔ ان فلاطون نے ایک سفر کی زندگی کو خاموشی، تنہائی اور ذہنی مافیہ سے بے خبری سے تعبیر کیا ہے۔ فلاسفر اچھائی کی تلاش میں ہی نردان چل کر لیتا ہے ویدانت اصلاح میں اسے چستہ سندھی یعنی مل پائیزگی کہتے ہیں۔

مولانا رادھ کرشنن کی زندگی، اولیٰک گیمز کے ہر پہلو پر محیط تھی وہ تاجر تھا۔ تو کاروبار کسے بے آیا تھا۔ ایک ایتھلیٹ کی طرح جس نے (بھارت رتنا) سب سے بڑا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اور ایک فلاسفر جس نے اپنی نرم خود آنکھ سے دنیا کا کاروبار دیکھا اور اپنی ساری زندگی دانا پر اشتا سے کرچستہ سندھی کی تلاش میں گزار دی۔ میں اسے زندگی کے ان تمام شعبوں میں سے گزرنے ہوئے دیکھتا رہا ہوں۔

پہلی ملاقات کے وقت وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب و اخلاقیات کا پروفیسر تھا۔ میں نے اس کی تمام تحریریں پڑھ کر رکھی تھیں اور اس سے گفتگو کے دوران اس کی تحریروں کے حوالے دیئے تھے مجھے یاد ہے میں نے اس کی خوشامد پسندی پر حمد کیا تھا اور اسے پرچ کرتے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ خوشامد پسند تھا اور اسے اچھا سمجھنا تھا جب وہ ماسکو میں سفیر تھا تو میں نے اسے سیکوں کی تاریخ کے تراجم جو میں نے کیے تھے بھیجے۔ اس نے جواباً میسرے طلبیوں کی نشاندہی کی اور مجھے دیدانت پڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ سکھ ازم کے بارے میں وضاحت سے جان سکوں۔ وہ رحمدل گمراہ تھا اور جن لوگوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کرتا

تھا ان کے لیے نکالین بھی اٹھانا تھا۔

۱۹۵۰ء میں جب وہ فلورنس کی یونیورسٹی کا نفرنس میں بھارت کی نمائندگی کے لیے گیا تو میں اس کے زیادہ قریب آ گیا۔ اس وقت میں اس کا پریس آفیسر تھا۔ ہر صبح اور شام ملاقات ہوتی۔ میں اس کی تقریریں کی رپورٹیں لکھتا تھا اور اس کے انٹرویو کر داتا۔ کانفرنس میں اس کی تقریر بہت ہی مدلل تھی اس نے نہایت عمدہ تقریر کی۔ میں جب وہ واپس آیا۔ اُسے دو دفعہ ہی خطاب کرنا تھا چنانچہ وہ تاریخ ہو کر اپنی کتابوں کی طرف راغب ہوا جو اس کے بستر کے قریب بکھری پڑی تھیں۔ وہ صرف حالات سے واقفیت رکھتا تھا لیکن کانفرنس کی کاروائی کو ذہن پر سوار ہونے نہیں دیتا تھا۔

بھارت نے کیونسٹ چین کو تسلیم کرنے کی قرارداد پیش کی تھی اور اس موقع پر اسے ایک سیشن سے خاص طور پر خطاب کرتا تھا اس مسئلے پر اس نے جو کچھ کہتا تھا کہا لیکن اپنے دلائل واضح کرنے کے بعد اس نے حاضرین سے ایک سوال کیا جو اس کے دماغ کی اولین سطح پر موجود تھا "بڑھتی ہوئی انسانی شخصیت" میں "نہائی کی اہمیت" ذہن کی ممکن خاموشی، قوت ارادی، روح کا خلا، مجمل کا فقدان۔ اس روشنی کی کمی جو ہمیں صحیح بنی نوع انسان بننے میں مدد دیتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔

ایک مشہور معروف ہالی وڈ فلم ستار غالباً مرنیا لائے نے رادھا کرشنن کے ساتھ فلسفے کے چند مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے وقت مانگا۔ میں اسے ڈاکٹر کے کمرہ، آرام میں لے گیا۔ وہ دھوٹی اور بنیان میں ملبوس اپنے بستر میں دراز تھا اس نے کتابوں ایک تھار پرے دھکیلی، بستر پر جگہ بنائی اور اپنی میزبان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ فلم ایکٹریس نے چمکی بٹ عسوس کی۔ شاید وہ ایک فلاسفر کے پاس بیٹھنے سے اپنی حیثیت کم ہو جانے کے اندیشے میں تھی۔ رادھا کرشنن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا "خاتون آپ کتنے مردوں کی بیوی رہ چکی ہیں اس وقت یہ خاتون امریکی دند کے لیڈر پر شادی کے طور سے ڈال رہی تھی اس

نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ فلسفے پر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

کرشنن مین کے نائب صدارت اور شری پتی کے دور کے بارے میں کم ہی جانتا ہوں۔ جب اس نے مجھے یاد دہانی کرائی کہ مجھے اس سے بے عرصہ ہو گیا ہے تو میں نے کہا کہ صدر کا وقت زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے اسے میرا جواب پسند نہ آیا وہ تو لوگوں کے کام آتا تھا بہت سے شرماں جڑا۔ اس کا استحصال کیا اس نے بھی غصے کا اظہار نہ کیا اور نہ ہی لوگوں کی اس کپنگی پر براہم ہوا میری اس کی آخری ملاقات تین سال قبل مدراس میں ہوئی۔ رزہ بہت کمزور ہو چکا تھا اس کی آنکھ کا آپریشن ناکام ہو گیا تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ میری بیٹی سے اس کے مستقبل کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ اس نے بستر سے فرش پر اپنے سیلے پڑنے کے بستر سے اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا "جب بھی مدراس آؤ تو میرے بغیر نہ جاؤ" مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ صرف تین سال زندہ رہے گا۔ شاید وہ ایک کامیاب ترین انسان تھا جو میری نظر سے گزرا۔ مجھے کینا کے شہید اسے ہیں۔

"انسان اکیلا ہی اپنا دوست ہے"

"انسان اکیلا ہی اپنا دشمن ہے"

اسی طرح دھماپہ میں لکھا ہے۔ انسان ہی اپنا آئینہ ہے اور انسان ہی اپنا مقصد ہے جب بھی مجھے اسی کی یاد آتی ہے اس کے اس معجز کی یاد بھی، نرم ہو جاتی ہے جو اس نے ہندو ازم کے بارے میں لکھا تھا "مٹھ کے اس مضمون کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"زندگی برج کے کھیل کی طرح ہے ہم کھیل سیکھا نہیں کرتے یا پتے ڈیزائن نہیں کرتے۔ ہم قوانین مرتب نہیں کرتے اور نہ ہی کھیل کی حالت پر کنٹرول کرتے ہیں۔ پتے خود ہمیں کنٹرول نہیں دے سکتے۔ اچھے یا برے۔ لیکن ہم اچھا کھیل بھی کھیل سکتے ہیں اور بُرا بھی۔"

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بہت ہی اچھا کھیل پیش کیا

رامن راگھاؤ۔ اسے پھانسی دو!

جب ایک شخص دوسرے کو قتل کرتا ہے، تو ہم اس کی وجوہ تلاش کرتے ہیں۔ جب ایک شخص بہت سے لوگوں کو قتل کرتا ہے، تو ہم اس کے دماغ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رامن راگھاؤ، جو بیس مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس وقت وہ دو دشمنوں کو قتل کرنے کے الزام میں ملوث ہے۔ اس نے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ جج نے اس کے وکیل کا یہ استدلال برطرف کر دیا ہے کہ رامن فائر الحقل ہے۔ "میں یا گل نہیں ہوں۔" رامن کہتا ہے۔ "تم سب پاگل ہو۔"

رامن نے یہ راستہ کیوں اپنایا۔ اپنے اعتراف کی بناء پر وہ اس وقت کا بہت بڑا مافی کیوں بنا؟ میں نے یہ سب اس کے اعترافی بیانات اور اس کے ڈاکٹر کی رائے سے اخذ کیا، جس نے اس کا علاج کیا تھا۔

رامن کا تعلق تامل ناڈو کے گاؤں سے ہے۔ اس کے خاندان کے چھ افراد ہیں۔ ماں کے لئے اس کے دل میں بہت کم پیار ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اسے اپنے باپ سے بہت پیار تھا۔ اس پیار کی توجہ وہ عجیب طریقے سے کرتا ہے۔ "میرا باب مجھے چوری اور قتل کرنا سکھاتا تھا۔ وہ خود بھی ایسا کرتا تھا۔ اور کئی دفعہ ان جرائم کی پاداش میں جیل گیا تھا۔" رامن بتاتا ہے۔ "پوری اثر فیصلہ کن تھا۔" چوری بڑا عمدہ پیشہ ہے۔ میں بچپن سے یہی کرتا آیا ہوں۔ اس نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ در سال میں مئٹریک کیا ہے۔

رامن کے والدین بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ اس کے تین بہن بھائی (جن کو وہ بہت محبت کرتا تھا) بھی مر چکے ہیں، صرف ایک بہن با رہتی زندہ ہے۔

عورتوں سے نفرت رامن کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ اُن کے پاس ہوتے ہوئے بھی اُن سے نفرت۔ معاملہ کچھ کچھ میں کہنے میں آنے والا نہیں۔ اس کے پہلے تجربے سے کچھ راز سے آگاہی ہوتی ہے۔ تامل ناڈو کی رسوم کے مطابق اس کی شادی اس کی بیٹی سے طے پائی، جس کا نام گروایا تھا۔ شب عروسی سے پہلے ہی اسے چوری کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس دوران گروایا کو حمل ٹھہرا اور ایک مردہ بچے کو جنم دے کر وہ دنیا سے سدھار گئی۔ یہ بیروانی اور دھوکہ ایک مرتبہ پھر ہوا۔ گاؤں کے بزرگوں نے اس کے لئے ایک لڑکی اور تلاش کی۔ رامن کو معلوم ہوا کہ یہ عورت پہلے ہی کسی مرد کے ہاتھوں خراب ہو چکی تھی، اور اس کے بچے بھی ہیں۔ اُسے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ شادی کے بغیر بھی جوڑ ہے، حاصل کر سکتا ہے۔

بورٹل جیل میں جس لڑکے سے رامن کی دوستی ہوئی، اس نے اسے بمبئی بلالیا۔ یہاں اُسے پہلی مرتبہ جنس مخالف کا تجربہ ہوا۔ دونوں دوست ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔ رامن دن کی شفٹ میں، اور اس کا دوست رات کی شفٹ میں۔ ایک رات جب بارش زوروں پر تھی، اس کے دوست کی بوری نے رامن کو اپنے بستر میں بلایا۔ رامن نے انکار کیا۔ اگلے روز عورت نے اپنے خاوند سے شکایت کی کہ گزشتہ رات رامن اس کی عزت پر حملہ آور ہوا تھا، لیکن وہ چمکی۔ رامن کو اس گھر سے نکال دیا گیا۔

اس طرح رامن کو دھوکہ دیا گیا۔ اس کی بے عزتی ہوئی۔ اور اس کو گایاں جگیش۔ اس کا یقین تختہ ہو گیا، کہ ہر بدخوشی کے پس منظر میں عورت مندر موجود ہے۔ وہ عورت سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گیا، اور لپیٹا بن گیا۔ اگر کوئی اسے کچھ نہ کہتا، تو وہ بھی کسی کو کچھ نہ کہتا۔ لیکن وہ بد فاش بن گیا۔ وہ اکثر آوارہ گردی میں گرفتار ہوا اور پولیس کے تشدد کا نشانہ

دھوکہ دہی، ڈاک زنی، چوری اور تشدد کے کئی مقدمات کے تحت اس نے کئی بار جیل یا ترائی۔ ایک درآدیوں کو قتل کرنے کے بعد وہ ثبوت نہ ملنے کی بنا پر وہ چھوڑ بھی گیا۔ دو دفعہ اسے ذہنی مریض کی حیثیت سے ذہنی امراض کے اداروں میں بھی بھیجا گیا، مگر ہر دفعہ نارمل رپورٹ ملی۔ وہ بمبئی میں اپنے شب و روز کے بارے کہتا ہے، "میں اکثر اوقات لوانیوں کے پاس جاتا تھا۔ میں مختلف عورتوں کے ساتھ، شب بھری کرتا رہا۔ میں چھپتی کرتا رہا، تاکہ زیادہ روپیہ حاصل کر سکوں۔"

"جنسی خواہش انسان کے سر پر مسلط ہو جاتی ہے۔ یہ شخص کو ضرورت ہوتی ہے۔" وہ ڈاکٹر فلسطیانہ انداز میں بتاتا۔ "جس طرح کار کو بیڑی کی ضرورت ہے، اسی طرح مرد کو جنسی تسکین کی۔"

اس طرح جنس اور جرم رامن کا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا، کہ رامن اپنی جنسی بھوک کہاں مٹاتا تھا۔ شاید شہر کے ریڈ لائٹ ایریا میں۔ لیکن چوری یا ڈاک زنی کے لئے جو مضافات کے دور دراز علاقوں میں جاتا۔ خاص طور پر ان لوگوں کے ہاں جو سلا بیا سیم کی وجہ سے نقل مکانی کر کے ایک دوسرے سے فاصلے پر رہنا شروع کر دیتے تھے، وہاں وہ رات کی خاموشی میں زنا کرتا، لوٹتا اور قتل کر دیتا۔ اس نے علاقے میں دہشت پھیلا دی۔ لوگ شام ہوتے ہی گھروں میں قید ہو جاتے۔ وہ ان کو ان کے گھروں میں آدبوچتا۔ اکثر اوقات راگیر صرف دس نئے پیسوں کے لئے قتل ہو جاتے، مگر ہر واردات بڑی پلاننگ سے ہوتی، اور تفصیلات ظاہر کرتی، کہ یہ کسی ایک ہی فرد کی کارروائی ہے۔ پہلے پہل وہ کنڈالٹ استعمال کرتا۔ بعد ازاں اس نے لوہے کے نوکدار ٹکڑوں کو استعمال کرنا شروع کیا، جسے وہ اپنے شکار کے کانوں کے پاس گھونپتا۔ جن لوگوں نے تاریکی میں اسے فرار ہوتے دیکھا، وہ کہتے ہیں، کہ اس نے دائرے اور سر کے بال بڑھا رکھے ہیں، اور سادھوں کی طرح ترشہل ہاتھ میں اٹھا رکھی

ہے۔ کچھ کہتے، کہ قاتل کتے کا بھیس بدل لینے پر قادر ہے، یا بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ اس کے اعترافات سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا، کہ یہ رامن راگھاڈ کا کام ہے۔ قتل کی ہر واردات ہر کسی کا خون منجمد کر دیتی۔

ایک چائے فروش، جس نے رامن کو گندی چائے پیش کی، بڑی شکل سے اپنی کھوپڑی بچا سکا۔ دوسرے اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ ایک واردات کا اعتراف کرتے ہوئے رامن کہتا ہے۔ "میں نے ایک باریش سلمان کو اپنی کھاٹ پر سوئے ہوئے دیکھا۔ صبح کے تین بجے تھے میں نے نوہے کی مضبوط سلاخ اس کے سر پر دے ماری۔ دائرے والا وہیں گر گیا۔ اس واردات میں اسے دو سو باسٹھ روپے حاصل ہوئے۔ لیکن چند روز بعد کی واردات میں اسے صرف دس نئے پیسے اور تھوڑا سا گھی میسر آ سکا۔ چند روز بعد پھر رامن نے ایک خاندان پر حملہ کیا۔ کچھ دنوں تک وہ ان کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ اس نے بتایا، کہ اس کو کھڑکی میں ایک کھاٹ پر ایک مرد، عورت اور بچہ لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ میں پھلی دیوار سے اوپر چڑھا، اور دیکھا، کہ عورت بچہ کو پاؤں والا دودھ پلا رہی ہے۔ میں نے سونے کی ایک زنجیر عورت کے گلے میں دیکھی۔ تین بجے تک عورت کو نیند نہ آئی۔ میں تین چار روز اس کو کھڑکی میں جاتا رہا، ہر دفعہ عورت بیدار نظر آئی۔ پانچویں روز وہ سوئی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے قبضے کاٹ کر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا۔ دو چار پاٹوں کے درمیان خالی جگہ پر کھڑے ہو کر میں نے مرد پر دو تین بار نوہے کی سلاخ سے ضرب لگائی، وہ گر گیا۔ عورت چلائے لگی۔ بچہ صرف دو ماہ کا تھا۔ دو تین منٹوں سے بچہ بھی ختم ہو گیا۔ پھر میں نے عورت کو بھی ختم کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں عورت کے ساتھ سوؤں گا بھی۔ میں نے عورت کے گلے سے زنجیر نکال لی۔ اس کی گردن کے گرد کالا دھاگہ تھا۔ میں نے وہ بھی ہموں لیا۔ زنجیر اپنی جیب میں ڈالی۔ مجھے چھ عورت کے

ساتھ سونے کا خیال آیا۔ عورت کے بستر کے قریب مٹی کے تیل کا لمپ تھا۔ میں نے روشنی ٹھل کر دی۔ لیکن اس وقت کسی نے جی جلائی اُدھر۔ ایک عورت بھاگتی ہوئی اُدھر سے نیچے آئی۔ اس کی عمر ستر برس کے قریب ہو گئی۔ جب اس نے خون دیکھا، تو چلائے لگی، میں بھاگ نکلا۔

خون کی یہ پہلی راتوں میں کھلی جاتی رہی۔ ٹنگ راتوں پہلے کے ذرنی سرسوں سے سرتے رہے، یا ان کی پٹیاں چیر دی جاتیں رہیں، لیکن قاتل ہر بار کسی نہ کسی طریقے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کا سب سے زیادہ ہیما نہ قتل کچھ یوں ہے:

آدھے فرلانگ کے ماسے پر ایک جھوڑی میں ایک عورت اور دو بچے سوئے ہوئے تھے۔ بچوں کی عمریں آٹھ نو سال کی تھیں عورت درمیان میں سو رہی تھی۔ میں نے تین چار ضربیں عورت کو لگائیں، وہ گر گئی عورت نے اپنے آپ کو صرف ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ تقریباً عمریاں ہی تھیں۔ میں اُس مردہ عورت کے ساتھ سو رہا۔ اور میں نے اس کی چھاتیاں بھی چوسیں، جن سے دودھ نکل رہا تھا۔

”کیا تمہیں خدا پر یقین ہے؟“ ڈاکٹر نے راس سے پوچھا۔

”جب میں چھوڑا تھا، تو خدا کو مانتا تھا، لیکن اب نہیں، میں مندر نہیں جاتا۔“

”کیوں؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”اس لیے کہ خدا عورت کی جانبداری کرتا ہے۔“ راس نے جواب دیا۔

راس کی یہ جنس زدہ نفرت اس کے جنسی استعارے کی واضح دلیل ہے۔ جب

جیل کے ناٹی نے اس کی ٹخنیں صاف کر دیں، تو وہ غیض و غضب میں آ گیا، اور ناٹی کو

قتل کرنے کے دے پہنچا گیا۔ سات دن تک اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ یہ تو

ایسے ہی ہے۔ جیسے کسی کا سر کاٹ دو۔ میں عورتوں اور زخموں کی طرح نظر نہیں آنا چاہتا۔“

اس نے ڈاکٹر کو دفاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”اگر میں تمہارے بچے کو ماروں، تو

تمہیں تکلیف نہ ہوگی؟ بالکل اس طرح مجھے اپنی ٹخنیں صاف کرنے کی تکلیف ہوئی ہے۔“

راس کو عورتوں کی خواہش ہے۔ اُس نے انتظامیہ کو پیشکش کی۔ ”مجھ کو ایک سال کے لئے ضمانت پر رہا کر دیں۔ میں جبری یا قتل نہیں کروں گا۔ میں ایک سال کسی عورت کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، بیوی کی حیثیت سے نہیں، ساتھی کی حیثیت سے۔ عورت کی عمر تیس سال سے کم ہوئی چاہیئے اور اگر بچہ پیدا ہو گیا، تو یہ حکومت کی ذمہ داری ہو گی۔ وہ میرے بچہ کو پالے۔ مجھے طوائف بھی قبول ہے۔ میں اس سے ہم بستری کرنا چاہتا ہوں، روٹیاں پکوانا نہیں چاہتا۔“

راس کے بقول اُسے مارا پیٹا گیا، اور اعتراض کر دینے کے لئے کھانچا بھی پلا یا گیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ لیکن پھر اس کے اندر کی آواز نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔ ”میں نے جبر کے زیر اثر اعتراض نہیں کیا، بلکہ میرے دل نے آواز دی، کہ اعتراض کر لو۔“

راس راگھاؤ سیاہ رنگت کا مضبوط بدن کا شخص ہے۔ وہ صاف ستھرا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بال، سفید قمیص اور کالی پتلون میں ملبوس (پولیس کمشنر ناڈکار نے مجھے بتایا، کہ راس اپنی پتلون تکٹے کے نیچے رکھ کر استری کرتا ہے۔)

اس کے ماتھے پر ہر وقت تیوری ہوتی ہے۔ اور ایسے معلوم ہوتا ہے، گویا وہ

دنیا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ کسی عبادت گزار کی طرح ٹہلنا ہے۔

جب جج مکرم عدالت میں آتا ہے، تو وہ تعظیم کے لئے کھڑا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا

رہتا ہے۔ اور جج کڑی اُسے پہنائی گئی ہے، اس کے درمیانی سرے کو اس طرح پکڑ کے

رہتا ہے، جیسے کوئی بادشاہ عصا کو۔ وہ عدالتی کارروائی بڑے اہمک سے دیکھتا ہے۔

وکیلوں کی آمد و رفت، سننے والوں کے چہرے۔ گویا کوئی بادشاہ اپنے دربار کا ملاحظہ

کرتا ہو۔ اور لوگوں کی آنکھیں ہمیشہ اس پر مرکوز ہوتی ہیں۔ جب وہ باہر نکلتے ہیں،

تو اس کی طرف بچھا کر نے کی جرات نہیں رکھتے۔ صرف ایک دفعہ ایک خوبصورت لڑکی نے مسکرا کر رامن کی طرف دیکھا، تو رامن کے چہرے پر ایک حریفانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب فردِ مجرم پر طعنه کر سنا لی گئی، تو رامن نے اعتراف کر لیا۔ حج نے پوچھا: تم مزید کچھ کہنا چاہتے ہو؟

”ہاں“ رامن نے جواب دیا۔ ”حکومت نے مجھے سرکاری وکیل تو مہیا کر دیا ہے، لیکن نہانے کے لئے مسابین اور سونے کے لئے محورت نہیں دی۔“

رامن کے اپنے ہی ضابطے ہیں۔ یہ اس کا قانون ہے۔ آفیسر کے سامنے سگریٹ نہیں پینا چاہیے۔ آفیسر کو اپنی ڈیوٹی کے دوران تمباکو نوشی نہیں کرنی چاہیے۔ اُس نے تشخص کے دوران ڈاکٹر کی پیش کردہ سگریٹ والیس کر دی۔ اور اس دوران جب ڈاکٹر نے سگریٹ سلگالی، تو رامن نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اس نے ایک برے پرچی بھر کر غصہ نکالا، جس نے پینے کے پانی کے ٹب میں اپنا ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس نے ایک بچی کو ٹبری طرح ڈانٹ پلائی، جس نے گندہ مدلل رامن کو واپس کر دیا تھا۔

وہ تقریر کردہ الفاظ کی عزت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ حج سے ایک ہی بات پوچھتا، کہ پہلے بیان میں کیا لکھا گیا ہے۔ وہ کہتا، ٹھیک ہے، میں نے اعتراف کر لیا ہے، لیکن ریکارڈ درست رکھنا چاہیے۔ وہ اپنا نام، پتہ، اور پڑے جو پولیس وادرات سے پکڑ کر لائی، چیک کرتا۔

اس نے اپنے استعمال شدہ ہتھیاروں کی بھی شناخت کی۔ قرض کے متعلق بھی اس کے اپنے ہی اصول ہیں۔ ”میں نے ہمیشہ ادائیگی کی، اور کبھی ادھار نہیں کھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ادائیگی کہاں سے ہوئی۔ میرے پاس رقم نہیں تھی، اس لئے میں نے

قتل کیا، اور رقم حاصل کی۔“

رامن راگھاؤ میں ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے، جسے خوف سا کوئی احساس نہیں۔ ”ہم ناڈو، مرنے سے خوف نہیں کھاتے“ وہ فخر سے کہتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے ہے جس کا گاہ ہے، جو اس سے خوفزدہ ہیں۔ اس نے بڑی رغبت سے عدالت میں اپنے ایک ہتھیار کی بیجاں کرا لی، حالانکہ اس وقت لوگوں کے سانس رُکے ہوئے تھے۔ ”دو نہیں“ وہ لوگوں سے کہتا۔

میں نے صرف ایک دفعہ اس کے چہرے پر خوف کی ایک موسوم سی لکیر دیکھی، وہ بھی چند ماہوں کے لئے۔ اُسے ایک ایک تصویر دکھائی گئی، جس میں درلاشین تھیں۔ انہیں قتل پر اس پر مقدمہ چلا تھا۔

”کیا تم انہیں پہچانتے ہو، جنہیں تم نے قتل کیا ہے؟“ آفیسر نے پوچھا۔ رامن راگھاؤ کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی لکیر ابھری۔ پھر اس نے فوراً اُن پر سے نظر ہٹائی، اور کہا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میری نظر کمزور ہے۔“

ستیہ جیت رے

کیمبرہ میں پہلی بار کسی فلم کے سٹائس لے رہا تھا۔ آرٹ ڈائریکٹر کا یہ دورِ اجربہ تھا۔ کلاسٹ میں شامل اداکاروں کی اکثریت پہلی مرتبہ کیمبرے کے سامنے آئی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہدایت کار باقی ممبروں کی طرح خام تھا۔ اس فلم کی تکمیل میں تین سال صرف ہوئے۔ شوٹنگ بھی صرف دیک اینڈ سیر ہی ہو کر تھی، جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت حاصل کرتے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے کام کئی کئی ماہ تعطل کا شکار رہا۔ لیکن نتیجہ کے طور پر جو کچھ پیرہہ ظہور برآیا، نقادوں نے اسے فلمی دنیا کا شاہکار مانا۔

پھر پنجالی نے ستیہ جیت رے کو فلمی دنیا کا سب سے بڑا ڈائریکٹر بنا دیا۔ اس نے بھارتی سنیما کو ایک سچا شاعر عطا کیا۔ اپرا جیتو اور آج پور سنسار فلمی دنیا میں خوبصورت شاعری کا خوبصورت نمونہ تھیں۔ شاید ڈان سکولٹی کے میکسم گورکی سیرالمیہ سے بھی زیادہ اعلیٰ۔ ایک درجن سے زائد فحش فلموں اور کئی چھوٹی فلموں کے بعد ستیہ جیت رے بھارتی فلم انڈسٹری کی پہچان بن چکا تھا، خاص طور سے غیر ملکی ناظرین کے لئے۔ درحقیقت ایک ایک نقاد کی اس رائے میں کوئی شبہ نہیں کہ رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد اگر ثقافت کے میدان میں کسی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے، تو وہ ستیہ جیت رے ہے۔

ستیہ جیت کی فلموں نے بین الاقوامی سطح پر باوقار ایوارڈ حاصل کیے ہیں۔

کیتز، ویس، ہرلن اور سان فرانسسکو کے فلمی میلوں نے ستیہ جیت رے کی اس غیر معمولی ذہانت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن گزشتہ ہفتے تو اسے ایک بہت قیمتی ایوارڈ "میگا سے سے" سے نوازا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ پہلی دفعہ کسی فلم ڈائریکٹر کو نصیب ہوا ہے۔ اسے فلمی دنیا کا شاعر ماننے ہوئے، اس کی فلموں کو مثبت اقدار کا حامل تصور کیا گیا ہے۔ اس کے ہیرو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اپنے معاصر فلم سازوں مثلاً فرانس کے تروفاٹ، سپین کا بونیل، سوڈن کا انگمر برگ مین، اٹلی کا فیلیپینی اور جاپان کا اکیا کیورو سوا سے فلم سازی میں بہت آگے تھا۔ اس نے ڈائریکٹر اور فلم بینوں کے درمیان تعلق پیدا کیا۔ سینما صرف تفریح کا سامان ہی ہیسا نہیں کرتا، بلکہ تخلیقی فن کا ذریعہ بھی ہے۔ جس طرح کہ کوئی نادل یا مصوری کا نمونہ۔ تروفاٹ کی "فیو لمز ایٹ فم" اور ریٹائٹس کی "ہیر شیا ملون آمار" میں کرداروں کی بجائے پلاٹ زیادہ طاقتور تھا۔ اور یہی پلاٹ ہدایت کار کا کسی بھی چیز کے بارے ذاتی نقطہ نظر ظاہر کرتا ہے، اور فلم بینوں کو متاثر کرتا ہے۔

رے نے بھی یہی مقصد سامنے رکھا ہے۔ لیکن اس کا طریقہ مختلف ہے۔ وہ شانتی نکیتن میں مصوری کے استاد نند پال بوس کی بات یاد کرتا ہے۔ "درخت کی تصویر ضرور بناؤ، لیکن مغزلی انداز میں نہیں۔ اوپر سے نیچے کی طرف نہیں، درخت اوپر کی طرف بڑھتا ہے، نہ کہ نیچے کی طرف"۔ رے کا کہنا ہے کہ اس کی تعظیم، زندگی اور مستقبل کے لئے یہ کلیدی مابینا کی تھی۔

وہ فلموں میں اپنے ذاتی نظریات کو جگہ دیتا ہے، اور اس کی خواہش ہے کہ اس کا پیغام اس کی ہر فلم میں شامل ہو کر عام تک پہنچے۔

کیا رے سہ سطر یہ زندگی ہے؟ دوسرے عظیم ہدایت کاروں کی طرح وہ جن طے شدہ اصولوں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ہر فلم میں اس کا نظریہ زیادہ سے

اور مناسب سمت والا نظر آتا ہے۔ اپنی پہلی پہلی فلموں میں وہ بھارتی بلکہ بنگالی مرد پرزہ یادہ توجہ دیتا ہے۔ لیکن بعد کی فلموں (جس میں چار دلتا زیادہ مشہور ہے) میں عورت اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ وہ اخلاقی فیصلے کو ٹھہرنے کے خلاف ہے۔ ”دیوی“ میں وہ توہمات کے خلاف ”ترقی پسند“ طاقتوں کے ساتھ اتحاد میں شامل نہیں ہوتا۔ جبکہ ”ہیڈپش“ میں وہ مذہب کو نرمی سے رگیدتا ہے۔ ”فال ساگر“ میں ایک مرتے ہوئے زمیندار سے اس کی پوشیدہ ہمدردی نظر آتی ہے۔ وہ مجسم تماقص ہے۔ ”کچن چنگا“ میں طبقہ اُمراد کے خلاف اس کی نفرت واضح ہے، لیکن ”بن کانی“ کی کہانیوں میں وہ ایک شخص کی تعریف کرتا ہوا نظر آتا ہے، جو سکاٹش جرابیں پہنتا ہے۔ آکسفورڈ سے تھوڑے استعمال کرتا ہے۔ بولین کی تعریف میں رطب اللسان ہے، بلکہ واعظ خود بین ہے۔

ستیہ جیت رے پر یہ اعراض کیا گیا ہے، کہ تشدد، جنگ اور سماجی اصلاحات کے سلسلے میں وہ ناکام ہوا ہے۔ لیکن اگر اس نے ایسی کوشش کی جس، تو وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ ہیرو کی سی دلیری کی بجائے ایک نرم خوی انسان کی کوششوں پر یقین رکھتا ہے۔ چینی لوب ہو سٹن کا کہنا ہے، کہ رے کے ہیرو، شاعر، ایسے ادیب جن کو پبلشر میٹر نہ آئیں۔ دائمی طالب علم، خواب دیکھنے والے، جو سوسائٹی میں مذاق کا نشانہ بنائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو کرکٹ کی باتیں کرتے ہیں، اور سبب کی درڑ میں شامل ہیں۔ اپنے تضادات اور مجموعات کے لحاظ سے رے مکمل طور پر ایک بھارتی ہے۔ حقیقت پسندی، انسانیت، شاعری اور ہندوستانییت اس کی فلموں کی اصل روح ہیں۔

لیکن ستم کی بات ہے، کہ شک و شبہ سے بالا تر غیر معمولی ذہانت کے باوجود ستیہ جیت بھارتی فلم بینوں کے لئے اجنبی ہے۔ پھر پنجول پر سرکاری حلقوں میں بہت

تنقید کی گئی، کیونکہ ان کے مطابق اس میں بھارت کا جو تصور پیش کیا گیا تھا، وہ مناسب نہیں تھا۔ فال ساگر کی تیاری کے دوران اُسے برقی قوس نہ مل سکے، جن کی اُسے شدید ضرورت تھی۔ رے خود انفسوس سے اس بات کا اظہار کرتا ہے، کہ جو عزت اُسے ملک سے باہر حاصل ہے، وہ اپنے ملک میں نہیں۔ کیا اس سے وہ بد دل ہو گیا ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ ”ذرا لح کا محدود ہونا ہماری ہنرمندی کے راستے میں رکاوٹ ہے، اور ایسے ہی نامساعد حالات میں شاپکار تخلیق ہو سکتے ہیں۔ میں جس جگہ ہوں، اور جو کام کر رہا ہوں، اس سے بے حد مطمئن ہوں۔“

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں، جو اس کا اظہار کر سکتے ہیں؟

بلراج ساہنی

میں نے کئی جگہ یہ بات تحریر کی ہے، اور محسوس بھی کی ہے، کہ مرد اپنی بیٹی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ میرے دوست بلراج ساہنی کو بھی چند ماہ پہلے اپنی بیٹی شبنم کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اس نے اس صدمے کو بظاہر بے جگری سے برداشت کیا، مگر ٹیس بہر حال دل میں موجود رہی۔

شبنم ایک نہایت ہی خوبصورت بچی تھی۔ زندگی اور سکراہٹ سے بھرپور۔ حتیٰ کہ اس کی عجیب حرکتوں میں بھی ایک دلچسپ خبر لی موجود تھی۔ اس کی شادی ہوئی، لیکن یہ شادی بربادی ثابت ہوئی، اور شبنم کی زندگی سے سکراہٹ غائب ہو گئی۔ بلراج بھی سکراہٹ اٹھوا کر بھول گیا۔ آخری بار جب میری ان سے ملاقات ہوئی، تو وہ جوہڑ والے گھر میں تھے۔ میں نے جب شبنم کو یاد دلایا، کہ اس کی زندہ دلی کتنے تو پنجاب بھر میں مشہور تھے، تو اس نے میری معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلادیا۔ جب کبھی ہم بلراج کے گھر جاتے، تو شبنم ہمیں کھانا اور میٹھی سرور کرتی۔ بلراج کی تعریفی نگاہیں اپنی بیوی کی حرکات و سکنات کا احاطہ کرتی۔

میں بلراج کو گزشتہ چالیس سال سے جانتا ہوں۔ میں کسی اور ایسے دوست کو نہیں جانتا، جس نے اتنی محبت دی، اور عوامانے میں کچھ ہی طلب نہ کیا۔ میں نے کئی بار اس سے تیز دند گفتگو کی، لیکن اسے کبھی غصہ نہ آیا، نہ ہی جواباً اس نے کوئی نغزولی گفتگو کی۔ اس کی محبت نہ میری دوستوں کے لئے بے انتہا تھی، بلکہ وطن کے لئے بھی وہ

اسی احساس کا مالک تھا۔ وہ سکول بچہ کی مشیت سے اس محبت کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عمل رائے کی دو ٹیکہ زمین میں اس نے رکتہ کھینچنے والے کا بھرپور کردار کر کے اس محبت کا اظہار کیا۔

میں نے بلراج کے مارکسی ہونے کو کبھی سنجیدگی سے نہ دیکھا۔ وہ تو غریب کا ساتھی اور اچھے کام کرنے والے کا محترف تھا۔ "داس کیپٹل" اس نے اسی جذبے کے تحت مطالعہ کی تھی۔ اس نے ترقی پسند نمائندوں کی انتہائی مہم میں حصہ لے کر اور قحط زدہ افراد کی مدد کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

کم لوگ جانتے ہیں، کہ بلراج مارکس، اینگلز یا لینن کی نسبت گرنٹھ صاحب کا زیادہ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کے مطالعے کے کمرے میں گرنٹھ صاحب کا بڑے سائز کا نسخہ ہمیشہ کھلا پڑا نظر آتا تھا۔ اور اس نے اس کے اقتباسات زبانی یاد کر رکھے تھے۔ اپنی مستقل مزاجی کی مدد سے اس نے پنجابی لکھنا سیکھا، اور اپنے مضامین گورکھن رسم الخط میں ٹائپ کیے۔ بمبئی سے شائع ہونے والے پنجابی رسالے "رجیت"، "سکائیٹ" وہ سالم لکھا کرتا تھا، اور اس کے کالم بے حد عمدہ تھے۔

بلراج کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اس کی زندگی کے تضادات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ یوم مٹی (مزدوروں کا عالمی دن) کو پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی موت تیرہ اپریل کو خالص سکھ ازم کی سالگرہ کے دن ہوئی۔ اس کی آخری خواہش تھی، کہ اس کی موت پر مذہبی رسومات نہ کی جائیں، لینن کی تعلیمات اور مہر خ جھنڈا اس کے پہلو میں رکھا جائے۔

کیا وہ کمیونسٹ تھا یا سکھ — ؟

بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھٹھ جی

ستید سائی بابا سے اس کی مشابہت حیران کن ہے۔ سر پر دیسے ہی کھپوں کے چھتے جیسے بال، آپ ہی کی طرح چمکدار آنکھیں۔ وہی نرم مسکراہٹ اور وہی نضران رُشک کا چہرہ۔ وہ بھی ویسے ہی معجزے کرتا ہے۔ فضا میں ہاتھ لہراتا ہے اور اس کی تھیلی پر دھننی (مقدس راکھ) ہوتی ہے۔ اس کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ وہ بیماروں کو تندرست کر دیتا ہے۔ ایک شخص کا دعویٰ ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ معجزوں کا یہ مالک، سب سے بڑے کا بھگوان شری نیل کنٹھ ٹھٹھ جی ہے جسے اس کے پیروکار مالک، راہنما، گرد اور خدا کا اداکار کہتے ہیں۔

اخبار میں اس کی آمد کے اشتہار بھی میری نظروں سے گزرے ہیں درشن کے خواہشمند امیر لوگوں کی رہائشی علاقے میں جلتے ہیں۔ نیل کنٹھ کا ایک پارسی پیروکار جوڑا مجھے وہاں لے گیا۔

طویل بل عبادت گزاروں اور ان کی نظروں سے بھرا تھا سب خوش لباس تھے اور ایرٹل کلاس سے ان کا تعلق تھا ایک ڈانس پر ایک خالی کرسی رکھی تھی جس پر ریشمی غلاف تھا۔ اس کے پاس ہی دوسری کرسی پر بابا کی رنگین تصویر رکھی تھی اس کے فریم کے گرد ایک ہار تھا اور درجنوں اگر بیاں اس تصویر پر معطر دھواں پھینک رہی تھیں۔

بابا آئے۔ سب لوگوں نے تعظیم کی۔ بعض نے ان کے پاؤں چھوئے۔ وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے اور عبادت گزاروں کے ساتھ مل کر گانے گئے اور تانہ بایا روم نامو نارائن کلثمی گناہتی اور دیگر تمام دیویوں کی عبادت کی جا رہی تھی۔

رہا، دھرم نامہ کا رب انہوں نے ایک چاندی کے نیمپ کی مدد سے رتی کاری کاٹنے اور تالیوں کی آواز عروج پر پہنچ گئی اور چانک ختم ہو گئی نیل کنٹھ جی اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ہم چھ لوگ ان کے فاس کمرے میں بندے گئے۔ ہم فرش پر ان کے پاؤں کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ گفتگو کی ان کو ہندی زبان پر عبور نہیں تھا اس لیے اپنے ایک چیلے سے انگریزی زبان کا ہندی مترجم پوچھتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک غریب کسان کے پانچ بیٹوں میں سے ایک ہیں۔ جب ان میں ورثہ تقسیم ہوا تو ان کے حصے تھوڑی سی چوہائی اور بیمار بابا بھی ان ہی کے حصے میں آیا۔

وہ کس طاقت کے زیر اثر ہیں۔ وہ خود نہیں جانتے لیکن لوگوں کے ذہن میں عجیب عجیب باتیں ہیں جب انہوں نے ایک بیمار شخص کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس کا بخار غائب ہو گیا جب انہوں نے ایک شخص کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا جو گنگرین کی وجہ سے اسے کٹوانے ہسپتال جا رہا تھا تو اس کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی۔ ایک جیل جو میرے چچے بیٹھا تھا بنانے لگا وہ دوبارہ زندہ ہوا ہے بابا نے مجھے دوسری زندگی عطا کی ہے کی تم ان کے گرد روشنی کا مار نہیں دیکھ سکتے۔ کیا میں نے بابا کے گرد روشنی کا جالہ دیکھا ہے؟

انہوں نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں آگے سرکا۔ انہوں نے اپنی تھیلی پر ٹکڑا کر ڈال دیا۔ میرے سر پر تھوڑی سی راکھ گرائی انہوں نے دوبارہ ایسا ہی کیا تو ایک براؤن رنگ کی رس بھری ان کے ہاتھ پر آگری۔ اسے اپنے گلے میں ڈالو۔ انہوں نے کہا۔ انہوں نے اپنی تصویر والا شیلڈ مجھے اپنی بے پروائی کے لیے ایک تصویر کا پرکھنے کو دی اور ایک انگوٹھی انکلی میں پہننے کے لیے دی جس پر ان کی تصویر کندہ تھی۔ ہر کچھ بھل ن کے لیے لائے تھے انہوں نے ہرے کے سامنے تقسیم کر دیئے۔ لیکن یہ صرف آپ کے لیے ہیں۔ ایک

خاتون نے مزاحمت کی۔ میں جس چیز کو ہاتھ لگانا ہوں وہ پر سادہ بن جاتی ہے۔
 انہوں نے کہا کہ اور عورت کو ایک سیب اور کیلا دے دیا۔ انہوں نے آندھرا
 پردیش کے ضلع کرنول میں ہمیں اپنے آشرم آدم نگر میں آنے کی دعوت دی جہاں
 لگے دسمبر ان کی مٹی کی شادی تھی۔ اس نے ہمیں دعائیں دیں اور ہم نے رخصتی
 شہری میل گنٹھ کے اندر ایک غیر فرت ہے جو لوگوں کو اپنی جانسب
 کھینچتی ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کے لیے سکون کا باعث ہیں اور جو لوگ پیرنائل
 موٹ ہیں یقین رکھتے ہیں ان کے لیے تو بابا کی ذات معجزوں سے بھری ہوئی ہے

ساتھی برت — عورت باز

آپ ایسے ادیب کے بارے میں کیا اندازہ لگائیں گے جس نے اپنی کتابیں اینجلا اینا این
 باربرا بریڈا، کیرولین، کوئی سنٹیا، ڈی بورا، ڈورین، آئی لین، الزبتھ، ایسی، ناظمہ، گیسل
 جینی، بیلین، گرین، آئرس جین، جنت، جوڈی، کاٹھی، کرستینا، لارا، لیونا، لینڈا، لورنا
 رن، مارگریٹ، میری، مے، موریلا، نٹالیا، نیسی، پینی، لوپ، فیلس، رائنا، رونا، رونا، سیلی
 سانتا، سوزن، تانا، نیا، آرسلہ، ویلا، دینڈی اور کئے نام کی ممنون ہوں

ایک عورت ہندوستانی کے اعترافات — اس کتاب کا کیا ٹائٹل ہو سکتا ہے۔
 اس کے لیے لغت نہیں دیا جاسکتا۔ ایک معروف ہندوستانی نقاد تو اسے پہلے ہی فحش
 قرار دے چکے ہیں۔ بد قسمتی سے کچھ ہندوستانی اس میں اپنا آئینہ دیکھ سکتے ہیں جنسی تبدیلی
 کے واقعات کے باوجود اس کتاب میں ایک بات ضرور موجود ہے اور وہ ہے اعتراف
 بہت کم ہندوستانیوں نے اپنی تخلیقات انگریزی زبان میں پیش کی ہیں لیکن انہوں
 نے اتنی چھی زبان پیش نہیں کی۔ لیکن ۳۲ سالہ ساتھی برت نے اعلیٰ برطانیوی ادبی
 حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے اور نقد دوں کی توجہ حاصل کر لی ہے۔

وہ عورت باز نظر نہیں آتا مگر سائنس دان اور سر کے ہل گنج کی طرف مائل مختصر سی دماغی
 کے پیچھے کمزور سی تھوڑی غیبت و غضب کی حالت میں وہ خوبصورت لگتا ہے، انگریزی
 بنطالی لہجے میں بولتا ہے تو مزاج کا معلوم ہوتا ہے جب میٹم میگزین نے کہا تھا کہ اس انگریز
 تو ہندوستان ہی میں رہ گئے ہیں تو یقیناً اس نے بنٹائیوں کو بھی شمار کیا تھا۔

میری اور برت کی بات چیت بنٹائیوں اور انگریزوں کی نفرت و محبت کے موضوع
 سے شروع ہوئی۔ بنطالی ہمیشہ انگریزوں کی ہرج و مرج غیبت کرتے ہیں ہندوستانی

ثقافتی روایات سے بالکل قطع نظر لیکن دوسری طرف انتہا پسندی ہے۔ بنگالی ہندوستانی روایات پر یہ دیتے ہیں اور اپنے آپ کو ان روایات کا محافظ سمجھتے ہیں۔ یورپ میں اگر کوئی قوم بنگالیوں کی طرح سوچتی ہے تو روز آئرش ہے۔ وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز ہیں لیکن انگریزوں کی روایات سے انتہائی متغیر بھی ہیں نے پوچھا: سفید چمڑی کے بالے احساس برتری رکھنے والے ہندوستانیوں کی کیا یہ خواہش نہیں ہوتی کہ کسی سفید لڑکی پر فتح یاب ہوں۔

”ہاں مجھے یاد ہے۔ ایک بنگالی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جس رات وہ انگریز عورت کے ساتھ سویا تھا، اس نے محسوس کیا کہ تاج برطانیہ اس کے رحم و کرم پر ہے۔“
”کیا ہمیں بھارت میں جنسی انقلاب کی ضرورت نہیں۔ خاص طور سے درمیانی طبقے کیلئے۔“
”جنسی انقلاب مسئلے کا حل نہیں کیونکہ یہ تو فوری طور پر اسکتا ہے۔ بنیادی طور پر جس تبدیلی کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ بزرگ نسل کی احمقانہ باتوں کی اطاعت سے گریز میرا یہ مطلب نہیں کہ بزرگ نسل واقعی احمق ہے اور نوجوان نسل ہوشیار میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک پچپن سال بوڑھے کو اس کی حقیقی عقل کے مطابق درجہ دینا چاہیے اور یہ ہرگز فرض نہیں کر لیتا چاہیے کہ اپنے سے چند برس بڑے سے وہ واقعی عقل مند ہے بزرگی کی یہ ہیبت مکمل طور پر ختم ہونی چاہیے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا جنسی انقلاب ناممکن ہے۔“

”کیا دونوں طرف ایسا نہیں۔ بھارت کی نوجوان نسل نے بذات خود بوڑھوں کی حکومت قبول کر رکھی ہے۔“

”ہاں۔ میں نے اپنی پہلی کتاب میں اپنے ایک ایسے چچا زاد کی مثال دی ہے جسے ایک کم ذات لڑکی سے محبت کرنے کی بنا پر بڑی حرج پٹا گیا تھا اور پھر اس نے کمال صحافت سے مجھے بتایا کہ اس کے باپ نے اسے ٹھیک ہی مارا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ کو اسی کا مفاد سن رہا تھا تو اس حرج یہ کہہ دیا کہ وہ تو نہ ہوتی۔“
”آپ بھارت کی نوجوان نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے۔“

”اپنے ماں باپ کی سرپرستی سے جتنا جلد نکل سکیں نطیس۔ اس کا نتیجہ بد اعتدالی کی صورت میں تو ضرور نکلے گا لیکن اس پر قابو پایا جا سکتا ہے بالآخر قیمت نتائج حاصل ہوں گے بس مربیانہ اور سرپرستانہ انداز سے باہر نکلیں معاشی طور پر سماجی طور پر جذباتی طور پر۔“
”کیا آپ نے ایسا ہی کیا تھا اور اسی لیے بھارت سے باہر چلے گئے تھے۔“
”مجھے کالج کی ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو کسی اور کی بیوی بن چکی تھی میرے اندر بغاوت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا اور یہی میرے لیے آخری دھارا تھا۔“
”اس فیصلہ کن علیحدگی میں کیا واقعات ہوئے۔“

”میں ایک دقیا لوسی برہمن گھرانے میں جوان ہوا۔ اس کی تمام تر پابندیوں کے ماتھے انیس سالہ نوجوان ہونے کے باوجود مجھے اپنی دل کو بتانا ہوتا تھا کہ میں کہا جا رہا ہوں اور رات سارے نوبت تک داپسی بھی لازمی ہوتی تھی۔ اگر کسی لڑکی کا فون آتا تھا تو تمام کی تمام فلیکس افرائڈی کا شکار ہو جاتی تھی اگر سگریٹ پیٹے دیکھ لیا جاتا تو سمجھو دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مجھے برٹش کونسل میں ایک دعوت میں بلا یا گیا۔ وہاں اور چیزوں کے علاوہ سکاپ بھی تھی۔ پیٹے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اپنج کے پوتھے جیسے جتنی دھسکی جو سوڈے سے بہہ رہی تھی میں نے ایک ایک سپ سے کمر تین گھنٹوں میں ختم کی اور پھر مجھے پاں کھانا پڑا اور جیونٹ کم کافی پڑی تاکہ گھر لوگوں کو اس کی بدبو نہ آ سکے میرے نام کچھ گئے خط کھول لیے جاتے تھے یہ کام پوشیدہ نہیں کیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی کو احساس تھا کہ وہ غیر معمولی کام کر رہے ہیں۔ ان تمام تطبیقات وہ باتوں سے میرے اندر ایک ماحول پیدا ہوتا گیا۔ نہ نہ ان سے جلد لڑکے پر چلتے ہوئے بزرگوں کی فرمائی ہوئی بہت سنی یہ کہ وہ نہ کہ قسم کی باتوں نے مجھے باغی بنا دیا۔“

”آپ کا خیال ہے کہ بھارت میں ان پابندیوں اور ایسے ماحول کی وجہ سے خنثی کام کی حوصلہ افزائی ناممکن ہے اور یہ بھی ملک چھوڑنے کی ایک وجہ تھی کہ آپ اس سے متعلق ہیں کہ اسی وجہ سے بہت سے بھارتی ادیب بھارت میں رہنے ہوسکتے تھے مگر بڑی ہیں سمجھ سکتے۔“
”میرا خیال ہے کہ یہ ممکن تو ہے لیکن وہ وہ انگریزی نہیں سمجھ سکتے۔“

تو اربیب قد آور ہے تو رد بلا شرکت غیر سے ایک اور زبان تخلیق کر سکتا ہے لیکن ایک باریک
سی تمیز ضرور رکھنی پڑے گی۔ اس کی تحریر میں اس معاشرے کی جھلک ضرور ملے گی جس میں
وہ رہ رہا ہے۔ زبان کی اہمیت وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ الفاظ کے مطالب کا فرق
معاشرے میں آنے والی تبدیلی سے واضح ہوتا ہے۔“

”کیا خیال ہے مغرب میں تخلیق ہونے والا ادب فی زمانہ صرف الفاظ کی سفید بازی اور محارم کی جادوگری نہیں۔ اور کیا اصل مسائل اور حقیقی تخلیقی غریب ابھی تک بھارت ہی میں ہیں۔“

یقیناً۔ ایک ناول نگار کے لیے یہ بہت زرخیز جگہ ہے۔ متنوع معاشرہ ثقافتوں کا تصادم مذاہب کا تفرقہ یقیناً یکساں دھڑکنے والے معاشرے سے زیادہ انگیزت کا حامل ہے۔ برطانیہ میں ایمپائر ختم ہونے اور طبقات کے جزوی طور پر ختم ہونے سے زندگی خاصی بے فک ہو چکی ہے۔ ایسی بے شک سوسائٹی کے اپنے فائدے اور نقصان میں خاموشی، سکون، سست روی، جزوی طور پر باخلاق اور کام کرنے کے لیے بہترین ماحول۔ یہ ہیں ایسے معاشرے کے فوائد اور نقصانات میں مردہ پن اور سنجیدگی اور اس طرح لوگ شہرت حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ اور کوئی کام تو ہوتا نہیں میرے خیال کے مطابق مسائل حاصل یہ ہے کہ بھارت میں نہ صرف زندگی گزاری جائے بلکہ اسے دریافت کیا جائے یہ تمام مواد اکٹھا کر کے اکیلینہ جانا چاہیے اور دماغ بھیڑ کر لکھنا چاہیے۔

کیا چار سو روپے کی یہ دوائے ہوٹل میں رہ کر آپ کو جس جرم نہیں ہوتا ہے
 نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے انتہائی کھتاؤں اور خفیہ علاقوں میں زندگی گزاری
 ہے۔ یہی اتنی غربت بسر کر چکا ہوں کہ میں ہر وقت اچھی رہائش اور اچھے ماحول کا
 متقاضی تھا اور میں اس میں کوئی احساس جرم محسوس نہیں ہوتا جب دوسرے لوگوں
 کی غفلت صاف کرتے ہوئے یا پھر سختی کے چار فٹ ذب پرفٹ سے ٹکنا دیکھتے
 ہوئے روزانہ بارہ تیرہ گھنٹے نہ رہے جائیں جیسا کہ میں کرتا تھا۔ درمزدوری میں مجھ پر نوڈ
 ہفتہ میں تیرہ چلتا ہے کہ غریبی ایک جرم ہے امارت دنی جرم نہیں ملتا۔

”لیکن کیا خدائی طور پر برا نہیں لگتا کیونکہ بہت سے لوگ تو وہ وقت کا کھانا حاصل نہیں کر سکتے۔“

”بلکہ اس۔ غربت میں کوئی رومان نہیں۔ غریب بھی اتنے ہی ذلیل ہیں جتنے کہ امیر۔ اور اس کے اظہار کے لیے ان کے پاس زیادہ طمانہ ہتھیار ہیں۔“

آپ کی دونوں کتابوں اور آپ سے گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے برطانیہ جانے کا انتخاب اس لیے کیا کہ وہاں جنسی طور پر آزادانہ ماحول ہے۔؟

”ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان عقل و دانش کا تبادلہ جس میں جذبات، جنسیات اور شہوانیت شامل ہوں، بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کسی کو یہ تجربہ حاصل نہیں ہوا تو اس نے ایک معذور کی طرح زندگی گزار دی ہے۔“

”کیا آپ اس بات کے حامی ہیں کہ شادی سے پہلے نوجوانوں کو اکٹھے رہنا چاہیے بشرطیکہ وہ اس عمل کو جرم نہ سمجھیں۔؟“

بالکل۔ ہر حالت میں۔ خواہ وہ احساسِ جرم ہی۔ کھیں۔ آپ کسی دوسرے کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں۔ صبح کے وقت بدبودار سانس رات کو بستر پر معطر ہو جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ چیزیں زندگی کا حصہ ہیں بھارتی مغربیت تبدیل کرنا پڑیں گے۔ لیکن تبدیل کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے اصل نکتہ تو یہ ہے کہ زندگی کا نام ہونا چاہیے تاکہ قبولیت کا۔

• شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا اسے ایک کھیت کے طور پر اپنانا چاہیے
— ایک دائمی بندھن —؟

[illegible]

”اور بچوں کا کیا ہوگا۔ وہ کہاں ٹپتے ہوئے ہیں۔“

”ہاں یہ ایک مسئلہ ہے۔ میرے پاس فی الحال اس کا کوئی حل نہیں اصل میں بچے ہی ہیں جنہیں اس سارے کھیر کو میں تسلیم ہوئی۔ دراصل ہم ایسی کشتی میں ابل رہے ہیں جہاں سے ہمیں ابھی پتہ نہیں چلتا کہ ہم نے آخر کار کیا کیا ہے۔“

اصل میں شادی کا ارادہ اس وقت معرض وجود میں آیا جب انسان کی طبیعت میں سال تھی یعنی ایک جوڑا شادی کے تقریباً دس سال میں اکٹھے گزارا پاتا تھا اور پھر باقی رہ جانے والا کسی اور کے ساتھ نہ دی کر لیتا تھا یہ خیال ہے یہ قدرتی حل تھا جنسی قنوع کا۔“

”یہ باطل درست سے بہت سے لوگ آج بھی اس طرح کے معاہدے کو لیتے ہیں ہر یار نہ اپنی جنسی نرمیوں میں آزاد ہوتا ہے۔ لیکن یہ جذباتی معاہدے کا باعث ہو سکتا ہے کسی مرد کے لیے یہ برداشت کرنا بہت مشکل ہے نہ اس کی بیوی آج کی اور کے ساتھ سمجھ رہی ہے۔“

”کیا آزاد می نسواں کی تحریک کا جنہ دی عنقریب بھی ہیں۔“

”یقیناً ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مرد اگر ساتھ میں اور توں کے ساتھ سو سکتا ہے تو یہ اس کی مردانی قوت یا مردانگی کی نشانی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر عورت ایسا کرے تو اسے فاحشہ کہا جاتا ہے۔“

”اور پھر سماج کی کچھ رسوم و قیود بھی تو ہیں۔“

”تو اور کیا۔ فرس کمر میں کہ میں اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے ساتھ سونے کی اجازت دینا ہوں تو معاشرہ مجھے کیا کہے گا۔ احمق، یوقوف گاڑ دی۔“ یہ سوجھ بوجھ میں نہیں رہا ہے آپ پر سچیدہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جلد ہی آپ اپنی بیوی سے کہیں گے: دیکھو۔ تم اپنی یہ حرکتیں چھوڑ دو کیونکہ میں نہیں چاہتا یہاں جب میں لوگ مجھے احمق اور گاڑ دی سمجھیں۔ اور وہ جواب دے گی: لیکن جب تم دوسری لڑکیوں کے ساتھ دیکھے جاتے ہو تو پھر وہ کیا کہتے ہیں۔“ وہ۔ اس کی فکر نہیں۔ کیونکہ میں ایک مرد ہوں۔ یہ آپ کا جواب ہوتا ہے اور آپ دیں۔“

”جی فون کی گھنٹی بجی ہے۔“ یہ ایک سوچا چلا چلنے کی خریدی ہوئی دانٹ دابٹن کے

آخری گھونٹ پی رہے تھے۔ ”یہ وہی مکار آسٹریلوی آرٹسٹ ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ وہ یہاں پر شراب پینے کے بہانے آنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ میری بیوی میں دلچسپی لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسے چاہتا ہے۔“

بالا صاحب تھیکری

ایس۔ ایس۔ چیف

بالا صاحب تھیکری (شیو سینا کالیڈر) ایک امریکی رسالے نے اُسے فسطائی بیان کیلئے۔ وہ خود یہ کہتا ہے، کہ ایک ہی کتاب ہے، جو میں نے پڑھی ہے، وہ ہٹلر کی کتاب میں کیمنٹ ہے۔ مجھے اپنے خیالات کو دوسرے قسم کے لڑ پکڑوں میں ملانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں نے بہت سے چلے جلو سوں کو سنا ہے، جو بالا صاحب کی شیو سینا نے کیے۔ اور جس نے بمبئی کی زندگی کو ساکت کر دیا، اور جنوبی ہندوستان کے رہنے والوں کو دہشت زدہ کر کے رکھ دیا۔ دو بھتے قبل جب میں ایڑا نڈیا کی ایک پیراد سے سنا کر دے کے ایڑ پورٹ کی طرف سفر کر رہا تھا، تو اس کو دو جگہ رکنہ پڑا، تاکہ ہر جہم ہر دار سینا کے، بخوم کو شیواجی پارک جانے کا راستہ مل سکے۔ اگلے روز حکومت کے ان احکامات کے باوجود کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اجتماع ممنوع ہے۔ اور اس یقین دہانی کے باوجود کہ دکانوں اور دفتر جانے والوں کو پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ سینکڑوں درجنوں کی تعداد میں جمع ہوئے، اور انہوں نے بمبئی میں ایسی ہڑتال کرائی، کہ جس سے بارہ گھنٹے ہر سارو بار مفلوج ہو کر رہ گیا۔ صرف وہی دکانیں کھلی رہیں، جن کی انہوں نے اجازت دی۔ صرف وہی محالیاں چلیں، جن کی انہوں نے ضرورت سمجھی۔ اور صرف ان اداروں میں کام ہوا، جہاں کام کرنے کی انہوں نے اجازت دی۔ اُس دن بمبئی میں وزیر اعلیٰ وی۔ پی۔ ناٹک کی حکومت مدھن، بلکہ شیو سینا کے چیف بالا صاحب تھیکری کی حکومت مدھن

میں نے اس سے ملنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے یہ سوچ کر خود پیر ملامت کی، کہ کوئی آخر ایک نامعلوم صحافی کے ساتھ مل کر کھانے کی زحمت نہیں کرے گا۔

کیا ہٹلر، موسلینی یا شالن کسی عام ادیب جیسے ہینس، جیوانی یا ایوان کو جواب دینا پسند کریں گے؟ اسی خدمت کی بنا پر تھیکری صاحب سے خود جا کر ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ بالا صاحب سانٹا کرڈز کی شاہراہ کے قریب ایک خوبصورت جدید طرز کی کالونی کے ایک چھوٹے سے ویلا میں رہائش پذیر ہیں۔ مجھے کوئی گارڈ نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سامنے والا گیٹ بھ بند نہیں تھا۔ صرف ایک بڑا سا کتا جو کہ گریٹ ڈینر نسل کا تھا، ہم پر بھونکنے لگا۔ وہ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گریٹ ڈینر نسل کے کتے بہت اچھے دوست ہوتے ہیں۔ مگر وہ اتنے بیوقوف ہوتے ہیں، جتنے وہ بڑے ہوتے ہیں۔ بہتر تھا، کہ وہ الیٹن نسل کا کتا رکھتا، جس کی خوراک کم ہوتی ہے، مگر خوراک زیادہ ہوتا ہے۔

یہاں پر چیف بذات خود ہمارے سامنے موجود تھا۔ ایک عام قسم کا انسان جس نے پتھر کے بنے ہوئے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ سفید پاجامہ اور قمیض پہن رکھی تھی، اور کندھے پر شال ڈال رکھی تھی۔ اُس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ خود اُس کے ہاتھ مجھے بڑے ملائم اور نرم محسوس ہوئے۔ ”جیتا ایک شیر کو سلام کرتا ہے“ اُس نے مجھ سے کہا۔ جیتا شیو سینا کا نشان تھا۔

میں نے جواب دیا، ”میں بہت ہی عزیز سمجھ شیر کی مثال ہوں“ وہ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا، جہاں صوفے، بازوؤں والی کرسیوں ٹیلیفون اور ریڈیو سیٹ سے سجا ہوا تھا۔ میں نے دہلیں شیواجی کی کی تصویریں دیواروں پر آویزاں دیکھیں۔

گرم جوشی سے آؤ بھگت کر نے پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس اشا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ جب بات ختم کر کے اس نے رسیور رکھا، تو میں نے اپنی بات دہرائی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا جواب دے سکے، ٹیلیفون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار جلد ہی اُس نے فون بند کیا، اور یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا، ”یہاں ہماری بات چیت نہیں ہو سکتی، اور پر چلتے ہیں۔ آپ اپنے جوتے اتار لیں، کیونکہ دوسرے کمرے میں ہمارے دیوتا ہیں“ میں نے ایسا ہی کیا، جیسا اس نے کہا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے سے گزرا، تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک نئے رسیدہ جوڑے اور شیواجی کی کئی تصویریں دیوار پر لگی ہیں۔ میں اس کے پیچھے سیرٹھیاں چڑھتا ہوا ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا۔ اُس نے پھروں کی شکایت کرتے ہوئے درمیانے درجے کا پٹکھا چلایا، اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ صوفے کے دوسری طرف شیواجی کی قدیم آدم تصویر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سر ہٹھ ہیر کی تین اور تصویر گئیں۔ میرا میزبان جب دیوتا کے بارے میں کچھ کہتا، تو اس کی مراد شیواجی ہوتی تھی (ایسا اس نے متعدد بار کہا) وہ شیواجی کے پورے القاب چترابجی شیواجی مہاراج کا استعمال کرتا۔ جب وہ یہ کہتا، تو اس کی آواز میں آہنگی آجاتی۔ جس سے اس کے ادب کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔

بالا ٹھیکری ایک شریف اور شگفتہ مزاج آدمی ہے۔ انہیں ایک عقلمند آدمی سمجھا جاتا ہے۔ میں بھی اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں۔

وہ ایک بہت اچھا کارٹونسٹ ہے۔ اور اس کی آواز بڑی پُرکشش ہے۔ اور ان تمام خاصیتوں کا امتزاج بہت پُر اثر ہے۔ میں یقین کر سکتا ہوں، کہ وہ سننے والے کو ضرور باندھ کر رکھ دیتا ہو گا۔ عام طور پر وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کا زیادہ حصہ مہاراشٹر کے رہنے والوں کے ساتھ ہونے والی بے الصافی ہوتا ہے۔ اور اس کی عقیدہ کا زیادہ تر نشانہ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے بنتے ہیں۔ بال ٹھیکری

کوئی اعلیٰ درجے کا سیاستدان نہیں ہے۔ اسے بے بس کر دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ شیو سینا کے پاس مہاراشٹر میں رہنے والے غیر مقامی لوگوں کو دینے کے لیے کیا ہے۔ وہ کچھ مسلمانوں اور سکھوں اور مسلمانوں اور سکھوں کا نام لیتے ہیں۔ شیو سینا باقی ہندوستان کو کیا دے سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے وہ یہ دیتا ہے، کہ مجھے پنجا۔ یوپی اور مدھیہ پردیش سے کئی دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔

میں نے اس سے اس الزامات کے بارے میں پوچھا، جو دہلی سے شائع ہونے والے بایں بازو کے ایک رسالے میں اُن کے خلاف فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے کے لیے لگائے گئے تھے۔ انہوں نے اس سے انکار کیا، اور کہا، میں فرقہ پرستی کا نمبر ایک دشمن ہوں۔ وہ اُن مسلمانوں پر سخت تنقید کرتے ہیں، جو مذہبی رفاکاری رکھتے ہیں۔ اور اسرائیل کے خلاف ہونے والے ہنگاموں اور اُن سیاستدانوں، جن کی وجہ سے الاقدس مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، پر تنقید کرنے پر اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

میں نے اس سے ”مین کیمف“ کے بارے میں سوال کیا:

اُس نے غصے سے جواب دیا، ”ہاں، میں نے اسے پڑھا ہے“ لیکن امریکی صحافی نے میرے ہٹلر جیسے ہونے کا جھوٹ بولا ہے۔ انہیں تجربات کی بناء پر میں صحافیوں کم ملتا ہوں۔ انگریزی پر میں تو خاص طور پر میرے خلاف ہے۔ وہ جان بوجھ کر شیو سینا کی طاقت کو کم بیان کرتے ہیں، اور ہماری تحریک کے خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ اُس نے مجھے بیڑ پیش کی۔ وہ مجھے اپنے والد سے ملانے لے گیا۔ پچاسی سالہ پروردہ فکر ٹھیکری چارپائی پر چڑھ کر مارے بیٹھا تھا۔ اُن کا کمرہ بھی گھر کے دوسرے کمروں کی طرح شیواجی کی تعداد سے الگ تھا۔ ایک بہت بڑا شیواجی کا مجسمہ ایک کونے میں پڑا تھا۔

میں الوداع ہونے لگا، اس نے پھر میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اور پھر اسی طرح

گرہیٹ ڈینر نسل کے کتے نے مجھے بھونک کر الوداع کیا۔

کیا وجہ تھی کہ یہ انسان دوست شریف آدمی اس قدر انقلابی اور تلخ بن گیا۔ کیا بچپن کا کوئی تجربہ؟ یا والدین کی شفقت سے محرومی یا کوئی اور واقعہ؟ یہ سب کچھ معلوم کرنا ایک وقت میں بہت مشکل ہے۔ ہاں کچھ حقائق مجھے ضرور معلوم ہوئے ہیں، کہ وہ چوڑا میں پیدا ہوا، اور میرٹھ تک توہم حاصل کی۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے۔ ایک ذہین مارتھوٹ ہے۔ وہ قری پرپس جرنل میں کام کر چکا ہے۔ مارتھوٹ کٹھی، الواسراہم اور ای۔ نرائن، جو کہ ٹک سا ایڈیٹر ہے، اُس کے ساتھیوں میں سے ہے۔ کچھ عرصہ اُس نے اپنا اخبار ماروٹ نکالا۔ اس اخبار میں انہوں نے بمبئی کے رہنے والوں کی تکالیف اور مشکلات کو سامنے لائے۔ اس طرح وہ دہلی کے محروم لوگوں اور طبقوں کا دل و دلچسپی بن گیا۔ مارٹھ نے ہی ٹیورسینا کو جنم دیا۔

کیا بالائیکری جمہوریت کے لئے کوئی خطرہ ہے؟ میں سمجھتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ ان کی تحریک کا بمبئی سے باہر پھیلنے کا بہت کم امکان ہے۔ ہمارا اثر دس ریاستیں پذیر غیر مقامی لوگ ہمارا اثر کے مقامی لوگوں کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتے۔ باقی ہندوستان کے لئے ٹیورسینا کے پاس کچھ نہیں، جیسا کہ طاقتور آر۔ ایس۔ ایس کے پاس۔ اس کے علاوہ بالا صاحب نے مجھے قائل کر لیا کہ وہ افسر نہیں ہیں۔ وہ ایک سیاسی رہنما ہے، یا شاید ایک قوی لیڈر۔ جس کا امکان کم ہے۔

دانیال وال کاٹ۔ قضائی سمگلر

میرا اور اس کا سامنا ایک ڈنر پارٹی میں ہوا۔ میں ٹھیک طرح سے یہ سن چکا تھا، کہ وہ دانیال وال کاٹ ہے، جو کہ ایک مشہور سمگلر ہے۔ مگر اس نے اس بات کو یہ کہہ کر خود ہی آسان بنا دیا کہ تم اسٹریٹ وکیل کے ایڈیٹر ہو؟ یہ ہی میری پسندیدہ مطالعہ کی چیز ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ آپ تو محافیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ دہلی میں کرتا ہوں، اور تلخی سے مسکرا کر بولا، وہ ایسے لوگوں کا گروہ ہے۔۔۔۔۔ جو کچھ وہ میرے بارے میں لکھتے ہیں، اسے براہ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے بارے میں ہے۔ وہ ہندوستان کی ہر چیز کے بارے میں تلخ رویہ رکھتا ہے۔ میں نے اسے جویا کر وہ بہت سے لوگوں کے دل جیت چکا ہے۔ وہ لاہور واپسی سے گزرتے ہوئے دہلی میں اپنے دوستوں کو چاکلیٹ اور سگریٹ بانٹتا ہوا پاکستان کی طرف نکل جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ میں یہاں سے اس لئے گزرتا ہوں کہ یہ راستے میں پڑتا ہے، لیکن، یہاں سے کوئی تحفہ کسی کے لئے نہیں لایا۔

اس نے مجھے انڈین ایئر فورس کے ساتھ ایک مقابلے کے بارے میں بتایا، جو اُسے روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی۔ یہاں ہنر پارٹیاں مار رہے تھے۔ انہوں نے مجھے گھر سے میں لے لیا، جبکہ میں پاکستان سے کافی دور تھا۔ ایک طیارے نے مجھے واپس مڑ جانے کا حکم دیا، اور ڈرایا، کہ وہ مار گرائے گا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کسی بھی جنگی جہاز کو مسلح کرتے ہوئے ایک گھنٹہ لگتا ہے۔ اور کوئی جیٹ طیارہ زیادہ دیر تک پینچ پرواز نہیں کر سکتا۔

میں کافی نیچے آگیا، اور تعاقب کرنے والوں کو اپنی تکمیل کرنے کو کہا۔ اس وقت پاکستانیوں نے ہماری گفتگو سُن لی، اور وہ میری مدد کرنے کے لئے آگئے۔ میرا کراچی میں شاندار استقبال کیا گیا۔ مجھ کو ٹیلیفون پر مجھے مبارکباد دی۔

وہ ہندوستان میں اپنے اور پرہیزگاروں کے بارے میں زیادہ بات کرنے کا خواہاں نہیں تھا۔ مگر وہ اس پر اصرار کرتا رہا، کہ اُس نے کوئی چیز سنبھال نہیں لی، اور یہ سب من گھڑت ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاست کے بارے میں حیرت انگیز طور پر بہت کچھ جانتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پاکستان کی جانب ہیں۔

وال کاٹ والپس پیرس چلا جاتا ہے۔ جہاں اپنے دوست کو دی ہوئی کار حاصل کرتا ہے، اور پھر لندن میں اپنے کاروبار کو منظم کرتا ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ انٹرویو سیمینار قائم کرنے کا، ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے پاس کافی دولت ہے۔

ایک بہت ہی خوشگوار اتفاق ڈنر پارٹی میں ہوا۔ سِر فلپ ڈالبورٹ، جو کہ سڈبیکینڈی کے شیریں میں سے تھے، اور بعد میں سفیر بھی رہے۔ شہر میں آئے۔ میں نے انہیں پارٹی میں جانے کے لئے راہی کر لیا۔ انہوں نے وال کاٹ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سنا تھا، لیکن انہوں نے ہماری باتیں سُن لیں۔ اور وہ ہمارے پاس آگئے۔ اور دانیال سے رسمی ڈپلومیٹک لمجے میں پوچھا، سِر وال کاٹ، کیا آپ ہندوستانی حکومت کے ساتھ ہیں؟ اس نے اسی لمجے میں جواب دیا، ہاں، میں اس حکومت کا چھ سال مہمان رہا ہوں۔

ڈالبورٹ اس دو معنی بات کو نہ سمجھ سکے، اور کہا، بہت خوب۔ میرا خیال ہے، آپ نے اپنا مقام خوشگوار گزارا ہو گا۔

ہماری زیرِ طبع مطبوعات

دورانِ سنگرمِ قلمی و ادبیات کے ادیبوں، کالموں اور خطوط کا مجموعہ

فلسفہ مزاح

ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نگار بلونت گارگی کی سوانح عمری

ننگی دھوپ

ہندوستان کی افسانہ نویس اجیت کور کی سوانح عمری

خاندان بدوش

ہندوستان کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار دلپ کور ٹوانہ کی سوانح عمری

ننگے پاؤں کا سفر

۱۹۴۷ء کے واقعات پر مبنی ماتنگا کی عظیم کتب

اور انسان مر گیا

مکتبہ شعر و ادب ○ سمن آباد ○ لاہور ۲۵